FAIZ 1911-2011
Pakistan Study Centre
University of Karachi

فیض کے آس پاس

پروفیسر سحر انصاری



کچھ اس کتاب کے بارے میں

زیر نظر کتاب نامور شاعر فیض احمد فیض کے بارے میں پروفیسر سحر انصاری کی تحریروں پر مشتمل ہے۔ یہ تحریریں دو طرح کی ہیں۔ ان میں پہلی قسم تو ذاتی اور تاثراتی نوعیت کی ایک تحریر کی ہے، جو 'فیض کے آس پاس' کے عنوان سے لکھی گئی ہے۔ سحر صاحب کی خوش قسمتی رہی کہ انہیں فیض صاحب کی صحبت بھی حاصل رہی اور ان کا غیر معمولی اعتماد بھی۔ یہ اسی اعتماد کا مظہر ہے کہ فیض صاحب نے اپنے بارے میں بعض غیر ملکی ادیبوں کی تحریروں کے ترجمے کے لیے سحر صاحب کا انتخاب کیا۔ سحر صاحب نے برسہا برس کے اس تعلق کی یادوں کو اب پہلی مرتبہ سپرد قلم کیا ہے۔ ان کی اس تحریر کے عنوان کو ہی اس کتاب کا عنوان بھی بنایا گیا ہے کیونکہ کتاب میں شامل دوسری قسم کی تحریریں جو فیض کی شاعری کی تفہیم اور اس کے تنقیدی مطالعے کے حوالے سے لکھی گئی ہیں، ان کو بھی شاید اسی تعلق خاطر نے ممکن بنایا ہے جو سحر صاحب کو فیض صاحب کے ساتھ رہا۔ ان تنقیدی مضامین میں بہت سے ایسے مباحث بھی موضوع گفتگو بنے ہیں جن میں وہ گہرائی نہ آپاتی جو کہ ان میں نمایاں ہے، اگر ان موضوعات پر سحر انصاری صاحب کو فیض صاحب سے بالمشافہ گفتگو کا موقع نہ ملتا۔

پیش نظر کتاب میں فیض صاحب کی چند نادر تحریریں بھی شامل ہیں جن کا کوئی نہ کوئی تعلق سحر صاحب سے بنتا ہے۔ آخر میں سحر انصاری صاحب کا مرتب کردہ فیض صاحب کی شاعری کا انتخاب بھی شامل کتاب ہے، جس کا مقصد یہ دیکھنا اور دکھانا ہے کہ تمام عمر ادب کی خدمت کرنے والا ایک ادیب اور مدرّس خود اپنے عہد کے سب سے بڑے شاعر سے کہاں کہاں سب سے زیادہ متاثر ہوا ہے۔

فیضؔ کے آس پاس

پروفیسر سحر انصاری

پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی

فیضؔ کے آس پاس

پروفیسر سحر انصاری

آئی ایس بی این (ISBN): 978-969-8791-29-2

ناشر: پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی

سرورق: خدا بخش ابڑو

طابع: ماس پرنٹرز۔ کراچی

پہلی بار: اگست ۲۰۱۱ء

قیمت: ۳۰۰ روپے

خریداری اور رابطے کے لیے:

پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی

پی۔او۔بکس نمبر ۸۴۵۰۔کراچی۔۷۵۲۷۰

ای۔میل: pscuok@yahoo.com

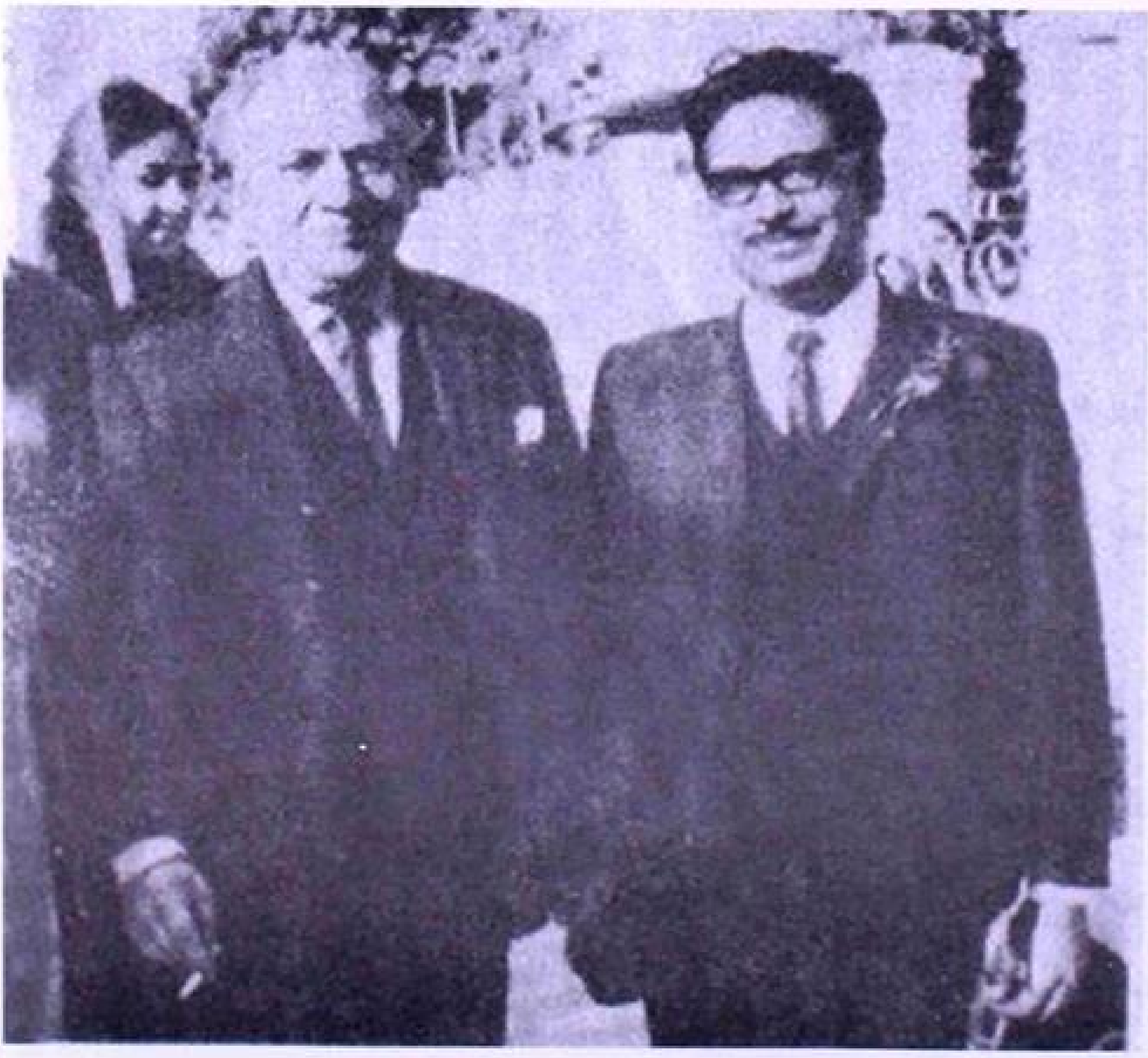
انتساب

پیاری بیٹی

عنبریں حسیب عنبر

کے نام

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہات میں تیرا ہات نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں



سحر انصاری، فیض احمد فیض کے ساتھ (۱۹۷۵ء)

فہرست

ضمیمہ جات

سر آغاز

اردو شاعری کی حد درجہ زرخیز اور درخشاں روایت میں اپنی ایک جداگانہ پہچان رکھنے والے معروف اور ہر دل عزیز شاعر فیض احمد فیضؔ کی ولادت کے جشنِ صد سالہ کے موقع پر ملک اور بیرونِ ملک جن علمی اور تہذیبی سرگرمیوں کا ان دنوں دور دورہ ہے اِن میں پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی نے بھی بساط بھر حصہ لیا ہے اور ایک سلسلۂ کتب کی اشاعت کے علاوہ ایک لیکچر سیریز اور ایک بین الاقوامی فیض احمد فیضؔ کانفرنس کے انعقاد کے ذریعے اپنے عہد کے ایک عظیم شاعر کے حضور اپنا ہدیۂ خلوص پیش کیا ہے۔ موجودہ کتاب بھی سینٹر کے مذکورہ سلسلۂ اشاعت ہی کا ایک حصہ ہے اور یہ بات بھی سینٹر کے لیے اعزاز کا باعث ہے کہ ہم معروف دانشور، ادیب، شاعر اور نقاد جناب پروفیسر سحر انصاری صاحب کے رشحاتِ فکر کو قارئینِ ادب کے مطالعے کے لیے پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

پروفیسر سحر انصاری صاحب ملک کے علمی و ادبی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ گذشتہ چار پانچ عشروں میں انہوں نے جس سنجیدگی اور یکسوئی کے ساتھ ادبی موضوعات پر تحریری اور زبانی طور پر اظہارِ خیال کیا اور ادبیات کی تدریس کا اہم فرض سرانجام دیا، اس کی ملک بھر میں پذیرائی بھی ہوئی اور اس کی وجہ سے ان کے ارادتمندوں کا ایک وسیع حلقہ بھی قائم ہوا۔

پروفیسر سحر انصاری جامعہ کراچی کے شعبۂ اردو سے وابستہ رہے ہیں جہاں انہوں نے کئی سال صدرِ شعبہ کی ذمہ داریاں بھی سرانجام دیں۔ اس سے قبل وہ بلوچستان یونیورسٹی سے وابستہ رہے۔ انہوں نے کئی دوسرے علمی و تحقیقی اداروں اور تنظیموں میں بھی فعال کردار ادا کیا۔ وہ اردو ڈکشنری

بورڈ کے مدیرِ اعلیٰ رہے۔ اس کے علاوہ وہ ادارۂ یادگارِ غالب کے نائب معتمد بھی رہے۔ ادھر پچھلے کئی سال سے وہ پاکستان آرٹس کونسل، کراچی کی ادبی کمیٹی کی سربراہی کے حوالے سے شہر کی علمی و تہذیبی سرگرمیوں میں روحِ رواں کی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔

پروفیسر سحر انصاری صاحب کا ایک خاص وصف نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور تخلیقی زندگی کے اس مرحلے میں ان کی مدد کرنا ہے جب یہ مدد سب سے زیادہ ضروری اور اگلی مسافتوں کے لیے رہنما ثابت ہوسکتی ہے۔ کتنے ہی اچھے تخلیق کار ان کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی کے سبب اب بڑے اعتماد کے ساتھ گلشنِ ادب کی آبیاری کر رہے ہیں۔

سحر انصاری صاحب ایک قابلِ ذکر شاعر ہیں جنھوں نے 'نمود' اور 'خدا سے بات کرتے ہیں' جیسے اہم اور باقی رہنے والے مجموعے قارئینِ ادب کی خدمت میں پیش کیے۔ وہ جوش ملیح آبادی کی نثری تحریروں کو 'مقالاتِ جوش' کے عنوان سے مرتب کر چکے ہیں۔ سحر صاحب کے سینکڑوں مقالات و مضامین ادبی رسائل اور جرائد میں شائع ہو چکے ہیں اور کتابی شکل میں مرتب ہونے کے منتظر ہیں۔

پاکستان اسٹڈی سینٹر کے ساتھ سحر انصاری صاحب کا دیرینہ تعلق ہے۔ ۱۹۸۰ء کے عشرے کے اوائل میں جب جامعہ کراچی میں اس سینٹر کی بنیاد رکھی گئی تو جن اساتذہ کا پہلے روز سے سینٹر کے ساتھ سرپرستی اور پُرخلوص تعاون کا رشتہ قائم ہوا، سحر انصاری صاحب ان میں سرِفہرست تھے۔ ہمارے لیے یہ بات باعثِ فخر ہے کہ گذشتہ اٹھائیس سال سے یہ تعاون کسی نہ کسی شکل میں برقرار رہا ہے۔ وہ ایک عرصہ ہمارے ہاں ایم۔اے کے کورس پڑھانے کے بعد اب جبکہ سینٹر میں ایم۔فل/ ایم۔ایس کا پروگرام بھی شروع ہو چکا ہے۔ اس پروگرام میں بھی تدریس کا کام کر رہے ہیں ان کی موجودگی اور رہنمائی ہمارے لیے اپنی کارکردگی کو بہتر بنانے میں ہمیشہ معاون رہی ہے۔

یہ بات ایک عرصے سے میرے پیشِ نظر تھی کہ سحر صاحب سے جن کو فیض صاحب کے بہت قرب رہنے کا موقع ملا تھا، درخواست کی جائے کہ وہ فیض صاحب سے متعلق اپنی یادداشتیں مرتب کریں۔ جب فیض صدی کے انعقاد کی بات چلی تو یہ خواہش مزید پختہ ہوئی اور سحر صاحب سے میں نے یہ درخواست کی کہ اگر ان کی مصروفیات ان کو خود ان یادداشتوں کو تحریر کرنے کا موقع نہ دیں تو وہ زبانی بیان کر سکتے ہیں اور ان کی بیان کردہ تفصیلات کو ہم ریکارڈ کر کے مرتب کر سکتے

ہیں۔ بہر حال یہ انتظام یوں ہوا کہ 'فیضؔ کے آس پاس' کے عنوان سے سحر صاحب نے اپنا مضمون لکھوا کر ہمیں خود بھی دے دیا اس کے بعد ان کے فیضؔ سے متعلق مضامین کی تلاش ہوئی اور چند تحریریں پرانے رسالوں اور جرائد سے نکال لی گئیں۔ اس کے بعد میں نے سحر صاحب سے مزید فرمائش کی کہ جس طرح 'نقشِ فریادی' پر ان کا مضمون پہلے سے شائع شدہ موجود ہے۔ اسی طرح وہ فیض کے دیگر مجموعوں پر بھی اگر الگ الگ مضمون لکھ سکیں یا لکھوا سکیں تو اس کے دو فائدے ہو سکتے ہیں۔ ایک تو اس طرح فیضؔ کے تخلیقی سفر کا پورا ارتقائی عمل پڑھنے والوں کے سامنے آجائے گا اور دوسرا یہ کہ اس طرح طالب علموں کے سامنے فیضؔ کی شاعری اپنے زمانی تناظر میں اُجاگر ہوگی اور یوں یہ طالب علم پاکستان بننے سے قبل اور اس کے بعد کے تیس پینتیس سال کے سماجی و سیاسی نیز بین الاقوامی منظرنامے کو ایک بڑے تخلیق کار کے تخلیقی تجربے کی روشنی میں دیکھ سکیں گے۔

یہ سحر صاحب کی بڑائی ہے کہ انہوں نے ان تمام فرمائشوں کو قبول کرتے ہوئے فیضؔ صاحب کی سب کتابوں پر اپنے خیالات زبانی طور پر بیان کیے جن کو ہمارے سینٹر کی اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر انور شاہین نے املا کی صورت میں تحریر کیا اور بعد ازاں ان تمام تحریروں کو سحر صاحب کے ترمیم و اضافے کے بعد اشاعت کے لیے تیار کیا۔ یہاں میں انور شاہین صاحبہ کا بھی مشکور ہوں کہ انہوں نے یہ اہم خدمت سرانجام دی جو خود ان کے لیے بھی مسرت کا باعث ہوگی۔

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے کہ سحر صاحب کے سینکڑوں مضامین و مقالات ہنوز رسائل و جرائد میں بکھرے پڑے ہیں جن کو یکجا کر کے موضوعاتی ترتیب کے ساتھ کئی کتابوں میں مرتب کیا جاسکتا ہے۔ کاش یہ کام ہو سکے اور اگر اس فرض کی انجام دہی کی کوئی سبیل ہمارا سینٹر پیدا کر سکا تو یہ اس کے لیے مزید افتخار کا باعث ہوگا۔

ڈاکٹر سیّد جعفر احمد

پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی

۲۸، اگست ۲۰۱۱ء

پیش لفظ

فیض احمد فیضؔ بیسویں صدی کے ایسے اہم شاعر تھے جنہیں ہم بڑے فخر کے ساتھ ان کے بڑے معاصرین کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ فیضؔ کی شخصیت میں خودنمائی اور خودستائی نہیں تھی اور عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ معاشرے میں اپنی شخصیت کو منوانے کے لیے ایسے ہی حربوں کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اس وقت تعجب اور مسرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب ہم دیکھتے ہیں کہ فیضؔ طبعاً ایک شرمیلے انسان تھے اور اپنی شہرت کے لیے کبھی انہوں نے کوئی ایسا ذریعہ اختیار نہیں کیا جو ان کی اور دوسروں کی نظر میں معیوب ہو۔ جو لوگ فیضؔ کے قریب نہیں رہے ان کے سامنے جب فیضؔ کی ان صفات کا ذکر کیا جاتا ہے کہ یہ عقیدت مندی کی مبالغہ آرائی ہے ورنہ فیضؔ کوئی پیر یا درویش تو تھے نہیں کہ دنیا ان کے ساتھ سائے کی طرح نہ رہی ہو وہ یوں بھی ورڈزورتھ کی طرح یقیناً سوچتے ہوں گے۔ 'The World is too much with us.'

لیکن اس کے باوجود دنیا کو انہوں نے اس حد تک ہی قریب آنے دیا جہاں سے وہ اس کی اصلاح کر سکیں۔ اب ایسی اصلاح کسی ایک فرد کا کام نہیں ہوتا لیکن فیضؔ کی مثال بھی وہی تھی جو ہر کارِ خیر کرنے والے کی ہوتی ہے کہ بقول کنفیوشس:

'It is better to light a candle, than to curse the darkness'

فیضؔ نے اپنی زندگی اور شاعری میں یہی فریضہ انجام دیا۔ ان کی شخصیت اور شاعری میں جو دلکشی اور جاذبیت تھی اس کی کوئی اور مثال ان کے معاصرین میں نہیں ملتی۔ وہ بہت ذہین، اپنے اظہار پر مکمل دسترس رکھنے والے اور وسیع المطالعہ انسان تھے۔ ان کی صحبت میں بیٹھ کر بہت کچھ

حاصل ہوتا تھا اور کبھی وہ یہ احساس نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ کتنے بڑے شاعر ہیں۔ میرا خیال ہے کہ جو شخص بھی ان کے قریب رہا اس پر یہ تاثر ضرور مرتب ہوا ہوگا کہ میں ہی سب سے زیادہ فیضؔ کے قریب ہوں یا انہیں سب سے زیادہ جانتا ہوں، یہ بھی ایک بڑے انسان کی پہچان ہوتی ہے۔ میری خوش قسمتی کہ مجھے فیضؔ صاحب کے قریب رہنے کا اور مختلف ماحول میں دیکھنے کا اتفاق ہوا اور مجھے یہ اعزاز بھی حاصل ہوا کہ انہوں نے میرے کیے ہوئے دو ترجمے 'سروادیٔ سینا' میں شامل کیے اور وہ ان کی کلیات 'نسخہ ہائے وفا' کا حصہ ہیں*۔ فیضؔ صاحب سے میری آخری ملاقات ان کے انتقال سے چند ماہ قبل ہوئی۔ انہیں میں نے کبھی غم سے نڈھال اور پریشان حال نہیں دیکھا۔ ان پر ان کا یہ شعر پوری طرح صادق آتا ہے۔

کرو کج جبیں پہ سرِ کفن مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا

اپنی ایک خوش نصیبی یہ بھی سمجھتا ہوں کہ میں فیضؔ کے صد سالہ جشنِ ولادت کا عالمی منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ پاکستان میں مسلسل ان کے لیے سیمینار، مشاعرے اور محفلیں منعقد کی جا رہی ہیں، کتابیں شائع ہو رہی ہیں، ان پر خصوصی شمارے مرتب کیے جا رہے ہیں۔ یہ لگتا ہے کہ فیضؔ ایک لمحے کو بھی ہم سے جدا نہیں ہوئے۔ وہ اسی خوب صورت مدہم مسکراہٹ کے ساتھ اپنے جشن کے روشن قمقموں کو دیکھ رہے ہیں اور ان کی شاعری کا نور ان روشنیوں میں مل کر رنگوں کی ایک دھنک بکھیر رہا ہے۔

پاکستان اسٹڈی سینٹر کئی اعتبار سے کراچی کے ایک نیک نام اور بے حد علمی اور عملی مرکز کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ اس کے بانی ڈائرکٹر پروفیسر ڈاکٹر حسین محمد جعفری نے کچھ اچھی روایتیں قائم کی تھیں، ان کے جانشین ڈاکٹر سیّد جعفر احمد جنہیں اب اس ادارے سے وابستگی کو ستائیس سال گذر چکے ہیں۔ پہلے پہل ایک سنجیدہ اور دانش افروز نوجوان کی حیثیت سے انہوں نے زمامِ کار سنبھالی اور اب یہ ادارہ دنیا کے تمام حلقوں میں جانا پہچانا جاتا ہے۔ اس کی اعلیٰ معیارات کی کارکردگی کو جزوی طور پر بھی بیان کرنا اس وقت ممکن نہیں۔ میں صرف اس امر کی مبارک باد دینا

---

* وی۔ جی کیرنن اور الیکسی سُرکوف کے مضامین کے ترجمے کے لیے دیکھیے، ضمیمہ نمبر ۱، اور نمبر ۲

چاہوں گا کہ انہوں نے فیضؔ کے جشنِ صد سالہ کو بہت مختلف اور منفرد انداز میں منایا ہے اور انگریزی اور اردو میں متعدد کتابیں فیضؔ کے حوالے سے شائع کی ہیں۔ ان میں میری کتاب 'فیض کے آس پاس' بھی شامل ہے۔ میں اپنے معاملات میں ہمیشہ لاپرواہ رہا ہوں۔ ایک مجموعہ 'نمود' ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا اور اب دوسرا مجموعہ چونتیس برس بعد منظرِ عام پر آیا ہے۔ خواہش کے باوجود کبھی یہ کتاب منصۂ شہود پر نہ آ سکتی اگر ڈاکٹر سیّد جعفر احمد اور ڈاکٹر انور شاہین نے اس میں بھرپور انہماک کا ثبوت نہ دیا ہوتا۔ انہوں نے اس کارِ خیر میں جتنا وقت، توانائی اور رفاقت کا ثبوت دیا ہے اس کا اجر علمی دنیا سے حاصل ہونے والی داد و تحسین ہی ہو سکتی ہے۔ میں ان دونوں اساتذہ کا جو میرے شاگرد بھی ہیں بے حد ممنون ہوں اور ان کی ترقی، صحت، خوشحالی اور علم افروزی کے لیے دعا گو ہوں۔

سحر انصاری

۱۲۷ گست ۲۰۱۱ء

فیضؔ کے آس پاس

فیض احمد فیضؔ کے بارے میں اپنی یادوں کو قلمبند کرنے سے پہلے میں اورنگ آباد دکن کے اس ماحول کا ذکر کرنا چاہوں گا جس کی بدولت دیگر ادبا اور شعرا کے ساتھ ساتھ فیضؔ کے نام سے بھی ابتدائی واقفیت ہوئی۔

ہمارا گھرانہ شعروادب کا دلدادہ تھا۔ ہر شخص کسی نہ کسی انداز سے ادب وشعر سے اپنی دلچسپی قائم رکھے ہوئے تھا۔ گھر میں ہماری والدہ کے لیے 'عصمت' اور 'تہذیبِ نسواں' والد کے لیے 'نگار'، 'مولوی' اور 'تجلی' جیسے رسالے آتے تھے۔ سب سے بڑے بھائی اخلاق احمد انصاری جس کالج میں پڑھاتے تھے اس کے پرنسپل بابائے اردو مولوی عبدالحق تھے۔ بھائی جان کو کتابیں پڑھنے اور سلیقے سے رکھنے کا شوق تھا۔ ایک اچھا خاصا کتب خانہ انہوں نے اپنے گھر میں بنالیا تھا۔ عموماً رات کے کھانے کے بعد ایک بیضوی ٹیبل کے گرد گھر کے افراد بیٹھ جاتے اور زیرِ مطالعہ کتاب کے صفحات بلند آواز سے باری باری پڑھتے جاتے تھے۔ ہم ابھی اسکول ہی میں تھے لیکن اس طرح کی محفل میں بیٹھنے یا بیت بازی میں حصہ لینے یا تعلیمی تاش کھیلنے میں برابر کے شریک ہوتے تھے۔ اسی زمانے میں ہم نے 'روشنک'، 'شوکت آرا بیگم'، 'شمیم' اور 'انور' جیسے ناول سن اور پڑھ لیے تھے۔ بھائی جان کے نصاب میں ایک کتاب تھی 'انتخابِ جدید' جسے عزیز احمد اور آل احمد سرور نے مرتب کیا تھا۔ اسی سے کئی شعرا کا نام اور کلام پہلی بار نظر سے گذرا، مثلاً ر خ ش، یگانہ چنگیزی، آنند نرائن ملاؔ اور فیض احمد فیضؔ۔ اس وقت بھی بیت بازی کے لیے ہی سہی اس کتاب سے بھی ہم نے استفادہ کیا اور بقول یگانہ۔

سمجھتے کیا تھے مگر سنتے تھے ترانہ درد

جب ۱۹۵۰ء میں ہم پاکستان آ گئے تو یہاں کے اخباروں اور رسالوں خصوصاً 'امروز' اور 'ادبِ لطیف' میں فیض احمد فیض کا کلام نظر سے گذرا۔ کراچی کے ادبی ماحول اور درسگاہوں کے اساتذہ کے خلوص اور تربیت نے اچھے اثرات مرتب کیے اور کالج میں آنے تک ادب کے معاصر منظرنامے سے کچھ نہ کچھ واقفیت ہونے لگی۔ ان ہی دنوں اخبارات میں دیکھا کہ اس وقت کی حکومت کا تختہ الٹنے کے الزام میں ادیب اور شاعر بھی گرفتار ہوئے ہیں۔ بعد میں اس کو راولپنڈی سازش کیس کا نام دیا گیا اس میں فیض احمد فیض بھی شامل تھے۔

ہمارے لیے یہ خبر زیادہ حیران کن نہیں تھی کیونکہ دکن میں سکونت کے دوران بطور خاص مخدوم محی الدین کی گرفتاری اور اسیری کا تذکرہ ہم سنتے ہی رہتے تھے، لہٰذا اتنا تو ہمیں پتا چل گیا کہ فیض و مخدوم کا ایک ہی قبیلہ ہے اور ان کے انقلابی خیالات کی سزا قید و بند کی صورت میں ملتی ہے۔

کالج تک پہنچتے پہنچتے ترقی پسند ادیبوں سے اچھا خاصا تعارف ہوتا چلا گیا۔ ان میں ہمارے سینئر بھی تھے جیسے پروفیسر ممتاز حسین، پروفیسر مجتبیٰ حسین، شوکت صدیقی، ابراہیم جلیس، پروفیسر انجم اعظمی، صہبا لکھنوی، رئیس امروہوی، قمر ہاشمی اور ہمارے ہم عمر بھی ان میں شامل تھے۔ صہبا لکھنوی اور 'افکار' کی بدولت فیض احمد فیض سے زیادہ ذہنی تعلق بڑھتا گیا کیونکہ اس وقت فیض کی نظمیں اور غزلیں جیل سے 'افکار' میں اشاعت کے لیے آ جاتی تھیں۔ فیض کا ایسا کلام پہلے 'افکار' میں اور پھر ان کے شعری مجموعے 'دستِ صبا' میں نظر آیا اب تو فیض احمد فیض سے خاص دلچسپی پیدا ہو گئی۔ 'نقشِ فریادی'، 'دستِ صبا' اور 'زنداں نامہ' ہر وقت مطالعے میں رہنے لگے اور جہاں کہیں فیض کی نثر یا نظم نظر آتی اسے ذوق و شوق سے پڑھتے اور دل ہی دل میں دعا کرتے کہ اس شاعر کو زندہ سلامت رہنا چاہیے کیونکہ اس وقت فیض سمیت ہر شخص جانتا تھا کہ اگر یہ الزام ثابت ہو گیا تو کم سے کم سزا، سزائے موت ہو سکتی ہے۔

پھر وہ ساعت بھی آئی جب دیگر وکلاء کے ساتھ ساتھ حسین شہید سہروردی اور شواہد و دستاویزات نے ثابت کر دیا کہ یہ سب اسیرانِ قفس بے گناہ تھے۔ فیض کی رہائی کی خبر نے نوجوانوں میں خوشی کی لہر دوڑا دی۔

فیض سے بالمشافہ ملاقات کا شرف ۱۹۶۰ء میں حاصل ہوا جب وہ انگلستان میں ایک طویل

قیام کے بعد پاکستان آئے۔ لسبیلہ سے آگے جانے والی ایک سڑک کا نام پہلے دیپ چند اوجھا روڈ تھا۔ پھر اس کا نام قاضی نذر الاسلام روڈ ہو گیا اور اب وہ بزنس ریکارڈر روڈ کے نام سے موسوم ہے۔ اسی روڈ پر مجید ملک اور بیگم آمنہ مجید ملک کی کوٹھی 'پیپی ہوم' تھی۔ فیضؔ صاحب نے یہیں قیام کیا یہ کوٹھی خوجہ جماعت خانے سے جہاں رئیس امروہوی اور ان کے خانوادے کی قیام گاہ تھی زیادہ فاصلے پر نہ تھی۔ ایک شام رئیس امروہوی، سیّد محمد تقی، جون ایلیا گفتگو کر رہے تھے میں جو پہنچا تو بھائی رئیس نے کہا بھائی بہت اچھے آگئے ہم لوگ ابھی فیضؔ صاحب سے ملنے جا رہے ہیں آپ بھی چلیے۔

ہم لوگ ٹہلتے ہوئے 'پیپی ہوم' پہنچے مجید ملک اور آمنہ باجی نے خوش آمدید کہا۔ ساتھ ہی فیضؔ صاحب نے خندہ پیشانی سے ہماری آمد کو قبول کیا۔ پہلی بار اپنے محبوب شاعر کو دیکھ کر بے حد مسرت ہو رہی تھی۔ درمیانہ قد، سوچتی ہوئی گہری آنکھیں، صاف شفاف کرتا پاجامہ اور داہنے ہاتھ کی دو انگلیوں میں دھواں دیتا ہوا سگریٹ۔ فیضؔ کی شخصیت یقیناً دل کش اور جاذبِ نظر تھی۔ رسمی گفتگو کے بعد ملک کے حالات زیرِ بحث آئے۔ ملک میں ایوب خان کا مارشل لاء لگ چکا تھا فیضؔ کے احباب نے انگلستان میں انہیں پاکستان جانے سے روکا بھی لیکن ان کا جواب تھا جانا تو ہے پس زنداں سہی یا سرِ دار سہی۔ یہیں انہوں نے ایک تجویز یہ پیش کی کہ ہم خیال ادیبوں کی ایک انجمن بنائی جائے کیونکہ ترقی پسند مصنّفین پر حکومت کی طرف سے پابندی عائد ہے۔

فیضؔ صاحب کا کلام اپنی جمالیات، انقلابی فکر اور طرزِ ادا کی بنا پر ہمارے لیے مسلسل مینارہ نور کی حیثیت حاصل کرتا رہا۔

اسی زمانے میں فیضؔ صاحب لاہور سے کراچی منتقل ہو گئے۔ سوسائٹی میں نرسری کے قریب ایک دو منزلہ کوٹھی تھی اس کے بالائی حصے میں فیضؔ اور ایلس فیض رہتی تھیں۔ ان کی دونوں بیٹیاں شادی کے بعد لاہور ہی میں رہیں۔ فیضؔ صاحب لیاری کے عبداللہ ہارون کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے، وائس پرنسپل ڈاکٹر م۔ رحسان تھے۔ اب ہم وہاں گاہے گاہے فیضؔ صاحب سے ملاقات کے لیے جاتے تھے اور کبھی وہ کالج کی کسی تقریب میں شرکت کی دعوت دے دیتے تھے۔ ایسے ہی ایک موقع پر مشہور مؤرخ اور انگریزی میں کلامِ فیضؔ کے مترجم وی۔ جی کیئرنن سے ملاقات ہوئی۔ تاریخ پر انہوں نے ایک لیکچر دیا جس کا ماحصل یہ تھا کہ ہم تاریخ کا مطالعہ کر کے تاریخ کو ویرانے

سے بچ سکتے ہیں۔

ان دنوں فیضؔ صاحب فقیر وحید الدین کی کتاب 'محسنِ اعظم' کا انگریزی میں ترجمہ کر رہے تھے۔اس کتاب کا تعلق رسولِ پاکؐ کی سیرت سے ہے فیضؔ کا ترجمہ 'The Benefactor' کے نام سے شائع ہوا۔

میں کبھی ایسے موقع پر پہنچ گیا تو فیضؔ صاحب معذرت کر کے کوئی کتاب یا رسالہ مجھے دے دیتے کہ ۱۵ منٹ دے دیجیے ذرا یہ تین صفحے مکمل کر لوں۔ میں دیکھتا تھا کہ بائیں ہاتھ میں اردو کی کتاب کھلی ہوتی تھی اور داہنے ہاتھ سے فیضؔ صاحب کا قلم اس تیزی سے انگریزی ترجمے سے گزر رہا ہوتا جیسے وہ ترجمہ نہیں کر رہے اصل عبارت کو نقل کر رہے ہیں۔

فیضؔ صاحب کے ساتھ نشستوں اور مشاعروں میں شریک ہونے کا شرف حاصل رہا غالبؔ کی صد سالہ برسی کے موقع پر بیگم آمنہ مجید ملک، سیّد سبطِ حسن، پروفیسر کرار حسین، زیڈ۔اے بخاری، سیّد محمد تقی، مسلم ضیائی، مختار زمن اور مرزا ظفر الحسن کی کاوشوں سے ایک ادارہ قائم ہوا جس کا نام 'ادارہ یادگارِ غالب' رکھا گیا۔ اتفاقِ رائے سے فیض احمد فیض ۸ اس کے صدر، آمنہ ملک نائب صدر، مرزا ظفر الحسن سیکریٹری اور میں جوائنٹ سیکریٹری مقرر ہوا۔ اسی ادارے کے تحت ایک غیر معمولی ادبی پروگرام 'غالب کے اُڑیں گے پُرزے' کے عنوان سے ایک میدان میں منعقد ہوا، جہاں اب پاکستان آرٹس کونسل کی عمارت ہے۔ مرزا ظفر الحسن کو ادبی عدالتوں کا خاص شوق تھا اس سے پہلے وہ امراؤ جان اور بنام مرزا رسوا جیسی ادبی عدالت کامیابی سے سجا چکے تھے۔ 'غالب کے اُڑیں گے پُرزے' اس اعتبار سے غیر معمولی تقریب تھی کہ مارشل لاء کے تحت اجتماعات پر طویل پابندی کے بعد یہ پہلی بڑی اور عوامی تقریب تھی جس میں کراچی کے علاوہ حیدرآباد اور سندھ کے کئی شہروں سے سامعین شریک ہوئے تھے۔ ہزاروں کا مجمع تھا اس میں جن حضرات نے حصہ لیا اور اسٹیج پر موجود تھے ان میں فیض احمد فیضؔ کے علاوہ پروفیسر حمید احمد خان، ممتاز حسن، مولانا غلام رسول مہر، زیڈ۔اے بخاری، سیّد محمد تقی، مختار زمن، پروفیسر ممتاز حسین، پروفیسر مجتبیٰ حسین، پروفیسر جمیل اختر خاں اور مرزا ظفر الحسن شامل تھے۔ بہت دلچسپ مکالمے ہوئے مختلف مباحث پر جمیل اختر خاں اپنی گردن کی جنبش سے گویا تصدیق کرتے جاتے تھے۔ ایک آواز آئی 'جمیل اختر خاں سب کچھ سمجھ رہے ہیں۔'

ساری محفل پر زیڈ۔اے بخاری چھائے ہوئے تھے ایک موقع پر سیّد محمد تقی نے کہا میں نے غالبؔ کو دریافت کیا ہے۔زیڈ۔اے بخاری مائک پر آئے اور تقی صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا 'لیجیے صاحب یہ غالبؔ کے کولمبس ہیں انہوں نے غالب کو دریافت کیا ہے۔'

غرض سنجیدگی، ظرافت، فقرے بازی اور شائستگی کی ملی جلی فضا میں یہ پروگرام دیر تک جاری رہا پھر موسیقی کی محفل برپا ہوئی۔ اسٹیج پر فیضؔ صاحب کے علاوہ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور دیگر حضرات بھی تھے۔فریدہ خانم نے غالبؔ کے علاوہ صوفی صاحب اور فیضؔ صاحب کی غزلیں بھی گائیں۔ میں ساتھ ہی بیٹھا تھا ایک غزل انہوں نے یہ گائی۔

وہ مجھ سے ہوئے ہم کلام اللہ اللہ

دوسری غزل فیضؔ صاحب کی تھی۔

یوں سجا چاند کہ جھلکا ترے انداز کا رنگ

یوں فضا بدلی کہ بدلا میرے ہمراز کا رنگ

فریدہ خانم نے مجھ سے پوچھا آپ کو میری گائی ہوئی کون سی غزل پسند آئی۔ میں نے کہا فیضؔ صاحب کی غزل۔انہوں نے پوچھا کیوں؟ میں نے کہا فن کو تو آپ بہتر جانتی ہیں لیکن میرے خیال میں ایسی غزل گانا جس کی ردیف رکنے کے بجائے فضا میں بکھر جائے آسان نہیں آپ نے اسے کمال گایا ہے۔ بہت خوش ہوئیں۔

اس یادگار تقریب کے بعد یہ طے ہوا کہ 'ادارہ یادگار غالب' کی ایک مستقل حیثیت بھی ہونی چاہیے چنانچہ ناظم آباد میں حبیب بینک اور کے۔ایم۔سی کے تعاون سے 'غالب لائبریری' کے نام سے ایک کتب خانہ قائم کیا گیا۔اس کا بورڈ اپنے مخصوص انداز میں صادقین نے لکھا، اس موقع پر کئی یادگار کتابیں شائع کی گئیں۔ پروفیسر کرار حسین کی کتاب 'غالب سب اچھا کہیں جسے' سندھی زبان میں بھی شائع کی گئی اس موقع پر جن اہلِ قلم نے غالبؔ سے متعلق کتابیں تصنیف وتالیف کیں ان میں پیر حسام الدین راشدی، عمر مہاجر، عبدالرؤف عروج، مسلم ضیائی، پروفیسر عبدالرشید فاضل بطور خاص قابلِ ذکر ہیں اسی تسلسل میں پہلے بڑے سائز پر سہ ماہی جریدہ 'غالبؔ' شائع کیا گیا جس میں ادارت مرزا ظفر الحسن کی تھی اور نائب مدیر میں تھا۔

فیضؔ صاحب سے ملاقاتوں اور ان کی محفلوں میں شرکت کا اعزاز حاصل ہوتا رہا۔فیضؔ

صاحب کی قیام گاہ کے سامنے خدیجہ بیگم کا بنگلہ تھا جو' بانی' کے نام سے موسوم تھا۔ وہاں اکثر شعرو نغمہ کی محفلیں جمتی تھیں۔ ان میں فیضؔ صاحب، سبطِ حسن صاحب اور ظفر الحسن صاحب دیگر مہمانوں کے علاوہ ضرور مدعو ہوتے تھے۔ اسی دوران میں مرزا ظفر الحسن نے یہ تجویز رکھی کہ فیضؔ صاحب نے جو خطوط اسیری کے دوران ایلس فیض کے نام انگریزی میں لکھے تھے ان کا اردو ترجمہ فیضؔ صاحب خود کریں اور جب وہ اس کام سے ہٹ کر ستانا چاہیں تو کوئی نظم یا غزل سہ ماہی غالب کے لیے عطا کر دیا کریں۔ میں اور مرزا ظفر الحسن ہر اتوار کو صبح نو بجے فیضؔ صاحب کی قیام گاہ پر پہنچ جاتے فیضؔ صاحب نہائے دھوئے صاف ستھرے کپڑے پہنے ایک سگریٹ ہاتھ میں لیے نکھرے نکھرے ہمیں خوش آمدید کہتے تھے۔ کبھی کبھی فیضؔ صاحب مجھ سے کہتے تھے کہ ذرا ہمارا ترجمہ باآوازِ بلند پڑھیے دیکھیں ہم نے کیسا کیا ہے؟ کبھی ہم اسی مشغلے میں منہمک رہتے کہ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو جاتا۔ ایلس اور فیضؔ صاحب کھانے کی میز کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہاں بھئی آیئے جو ہے سو حاضر ہے۔ ایک دفعہ اشتیاق طالب بھی ہمارے ساتھ ایسے ظہرانے میں شامل تھے۔ یہ تذکرہ میں نے یوں ضروری سمجھا کہ چند افراد نے اپنی بعض یادداشتوں میں یہ تاثر دیا ہے کہ فیضؔ صاحب کسی کی خاطر مدارات پر توجہ نہیں دیتے تھے۔ ہمارا تجربہ اس کے برعکس رہا۔ چائے کے وقت چائے یا کافی، اور کھانے کے وقت کھانے پر ضرور اصرار کیا جاتا تھا۔

فیضؔ صاحب کو جب روس کی طرف سے لینن امن انعام ملا تو ماسکو روانگی سے قبل ایک پہلا بڑا جلسہ آرٹس کونسل کراچی ہی میں منعقد ہوا۔ اس کی صدارت شاہد احمد دہلوی نے کی تھی۔

وقت گزرتا رہا، پاکستان ۱۹۶۵ء کی جنگ سے الجھا اس واقعہ پر بھی فیضؔ نے کئی نظمیں لکھی تھیں۔ پھر ایوب خان کی حکومت کے خاتمے کے بعد یحییٰ خان کا دور آیا اور ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں مشرقی پاکستان الگ ہو گیا۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ ایک مختلف تجربے سے دوچار کر رہی تھی۔ اتنی طویل مدت تک جو آبادی ہماری اچھے برے کی ساتھی رہی اسے یک لخت چھوڑ دینا یا فراموش کر دینا اتنا آسان نہ تھا۔ مغربی پاکستان کے اکثر سرکردہ اہلِ دانش مشرقی پاکستان میں فوج کی کارروائیوں سے خوش نہیں تھے۔ انہیں جنرل ٹکا خان کا یہ نعرہ پسند نہیں آیا کہ ہمیں آدمی نہیں سرزمین چاہیے۔ ان ہی دنوں ایک دن میں فیضؔ صاحب کے یہاں صبح ہی صبح پہنچ گیا تو دیکھا کہ ان کی میز پر ایک تازہ تحریر رکھی ہے میں نے پوچھا' فیض صاحب یہ کوئی تازہ نظم ہے؟'' جی ہاں رات ہی ہوئی

ہے۔' کہہ کروہ کاغذ انہوں نے میرے حوالے کردیا۔ نظم یوں شروع ہوئی۔

سجے تو کیسے سجے قتلِ عام کا میلہ
کسے رُلائے گا میرے لہو کا واویلا

پھر تو جیسے روز یا ایک آدھ دن کے وقفے سے فیض صاحب کا کرب اشعار میں ڈھلنے لگا۔ ایک غزل کا شعر مجھے یاد رہ گیا۔ یہ غزل شاید ان کے کسی مجموعے میں نہیں ہے۔ مجھے یہ شعر یاد رہ گیا۔

بیٹھا ہے فردِ خانہ خرابی لیے ہوئے
اس در کے سامنے کوئی اس در کے سامنے

فیض صاحب کے قیام کراچی کے دوران ان کا مجموعہ 'سر وادیٔ سینا' مرتب اور شائع ہوا۔ اس کے خاصے حصے پر ۱۹۶۶ء کی عرب اسرائیل جنگ کی چھاپ ہے۔ اس کی ترتیب کے دوران فیض صاحب نے اپنی کچھ غزلوں اور نظموں کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا کہ 'اپنے طالب علموں سے کہیے رسالوں اور اخباروں سے ڈھونڈ نکالیں۔' پھر انہوں نے مجھے وی۔ جی کیرنن اور روسی شاعر ایلکسی سرکوف کے مضامین ترجمے کے لیے دیئے۔ میرا اعزاز کہ یہ دونوں تراجم 'سر وادیٔ سینا' میں شامل ہوئے اور پھر جب فیض کی زندگی میں ان کا کلیات 'نسخہ ہائے وفا' شائع ہوا تو یہ ترجمے اس کا مستقل حصہ بن گئے۔

اس کتاب کی ترتیب کے دوران مکتبۂ دانیال کے مالک ملک نورانی سے جو فیض صاحب کے پرانے دوست بھی تھے، یہ طے پایا کہ اس کی قیمت کم سے کم رکھی جائے۔ یہ کتاب دبیز کاغذ اور فوٹو آف سیٹ پر شائع ہوئی تھی۔ اس پر یقیناً لاگت زیادہ آئی ہوگی لیکن ملک نورانی نے فیض صاحب کے احترام میں اس کی قیمت پانچ روپے رکھی تھی۔

فیض کی ایک نظم 'افکار' کے فیض نمبر میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا عنوان تھا 'طالب علموں کے نام' اس نظم میں کڑیوں کا لفظ تھا ایک دو اور بھی الفاظ تھے۔ میری یہ ہمت تو نہ ہوئی کہ میں فیض صاحب سے کہتا کہ لفظ طالب علم ہے اور اس کی جمع میں اضافت غائب ہوگئی۔ میں نے ایسے لفظوں کے نیچے لکیر کھینچ کر آگے چھوٹا سا سوالیہ نشان بنا دیا۔ کتاب شائع ہوئی تو میں نے دیکھا کہ فیض صاحب نے اس کا عنوان یوں کردیا 'پڑھنے والوں کے نام' اسی طرح کڑہ جیسے الفاظ کی حاشیہ میں صراحت بھی کردی۔ پہلے ایڈیشن میں ایک دو الفاظ کا تلفظ غلط بندھ گیا۔ میں نے جھجکتے ہوئے اس کی

نشاندہی کی۔ فیض صاحب بولے بھئی چھپتے ہوئے آپ نے ٹھیک کر دیا ہوتا۔ میں نے عرض کیا۔

یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

فیض صاحب کے لیے یہ کہنا ہمیشہ سچ رہا کہ 'جائے استاد خالی است'۔ وی۔ جی۔ کیئرنن کے مضمون میں دہلی کی ایک رات کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف نے لکھا تھا 'At night, rikshaws were running like demons in the streets of Delhi.

میں نے ڈیمن کا ترجمہ سوچا 'بھوت پریت، عفریت' آخر کار میں نے لکھا رکشہ بھوتوں کی طرح دہلی کی سڑکوں پر دوڑ رہے تھے۔ فیض صاحب کے سامنے انگریزی متن نہیں تھا۔ انہوں نے بھوتوں کی جگہ چھلاووں کا لفظ لکھ دیا اور میں ان کی عظمت کو مان گیا کہ رکشہ کے لیے چھلاووں سے بہتر کوئی تشبیہ نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح ایک موقع پر Walking on the razor's edge کا ترجمہ انہوں نے کیا تھا 'تلوار کی دھار پر چلنا' الفاظ کے بارے میں اکثر فیض صاحب سے گفتگو رہتی تھی۔ ایک دن میں نے کہا فیض صاحب آپ عربی کے عالم بھی ہیں اور قید و بند کے زمانے میں قرآن کا ترجمہ اور تفسیر بھی بیان کرتے تھے۔ یہ جو قرآن میں روح کے لیے امر ربی آیا ہے، یہاں حکم کے کیا معنی ہیں فیض صاحب نے جواب دیا 'بھئی آپ جانتے ہیں عربی میں ایک لفظ کے کئی کئی معنی ہوتے ہیں اور اردو والوں نے امر کا ایک ہی مفہوم لے لیا یعنی حکم یہاں امر سے مراد phenomenon ہے۔

ایک نشست میں، میں نے پوچھا فیض صاحب حافظ اور غالب سے آپ سب سے زیادہ متاثر ہیں۔ بولے 'ہاں بھائی یہ ہمارے معنوی استاد ہیں'۔ ایک بار میں نے کہا آپ پنجابی میں شعر کیوں نہیں کہتے۔ کہا 'بھئی ہم وارث شاہ، بلھے شاہ اور شاہ حسین جیسی پنجابی تو نہیں جانتے نا؟ اس سے کم تر لکھنا ہماری سمجھ میں نہیں آتا'

ایک موقع پر میں نے کہا آپ شاعری میں الفاظ کا اہتمام کس زاویے سے کرتے ہیں۔ بولے 'یہ ایک پیچیدہ عمل ہے۔ اس میں لفظ کی معنویت، تمثیلی رنگ، لکھنے والے کی جمالیات اور فکر و جذبہ سب ایک اکائی بن جاتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ کیمرہ کی طرح ہر لفظ کا ایک فوکس ہوتا ہے ہماری کوشش ہوتی ہے کہ لفظ آوٹ آف فوکس نہ ہونے پائے۔

جب 'نسخہ ہائے وفا' شائع ہوا تو اس کی اوّلین نسخے کے نسخے فروخت کے لیے بیگم آمنہ مجید

ملک کے زیرِ انتظام 'ٹڈ ٹاؤن بک شاپ' میں رکھے گئے۔ یہ نسخے فیض صاحب کے دستخط سے فروخت ہوئے۔ فیض صاحب بک شاپ میں بیٹھے تھے اور ان کے عشاق کا ہجوم تھا کہ بڑھتا ہی چلا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ سادہ لباس میں پولیس کو بھی تعینات کیا گیا۔ فیض کا دستخط شدہ نسخہ میرے پاس بھی ہے۔

۱۹۶۸ء کی ایک سہ پہر کو میں فیض صاحب کے یہاں ادارہ یادگارِ غالب کے بارے میں کچھ گفتگو کر رہا تھا کہ اتنے میں فیض صاحب کے کچھ قدیمی دوست آ گئے۔ ان میں انیس ہاشمی، محمد حسین عطا بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ باتوں باتوں میں انہوں نے کہا فیض صاحب کوئی نئی چیز کہی ہو تو سنایئے فیض نے ایک قطعہ سنایا۔

ضبط کا عہد بھی ہے شوق کا پیمان بھی ہے
عہد و پیماں سے گزر جانے کو جی چاہتا ہے
درد اتنا ہے کہ ہر رگ میں ہے محشر برپا
اور سکوں ایسا کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے

سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ انیس ہاشمی نے کہا فیض صاحب یہ آپ مایوسی کی بات کب سے کرنے لگے ہم تو آپ کے کلام سے حوصلہ اور قوت حاصل کرتے ہیں۔ فیض صاحب نے جواب دیا 'بھئی ہم بھی انسان ہیں ہم پر بھی کبھی ایسی کیفیت طاری ہو سکتی ہے۔ آپ تو یہ دیکھیے کہ میرے کلام کا غالب رنگ کیا ہے۔'

سب خاموش ہو گئے اور پھر فرمائش کی کہ اچھا اسے چھوڑیئے وہ نظم سنایئے۔

مرے وطن ترے دامان تار تار کی خیر

فیض صاحب نے یہ نظم سنائی پھر کچھ اور کلام سننے کے بعد یہ محفل برخاست ہو گئی۔

فیض کے آس پاس رہتے ہوئے جس طرح میں نے انہیں دیکھا اور جو کچھ ان سے سنا خواہ وہ ایک لفظ ہی کیوں نہ ہو جی چاہتا ہے کہ فیض شناسوں کی نذر کر دوں۔ فیض صاحب کی بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ کسی محفل اور گفتگو میں یہ احساس نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ اتنے بڑے اور اس قدر محبوب شاعر ہیں ان کی کوئی نظم یا غزل پڑھ کر میں اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتا تو خط میں یہی لکھتے 'آپ کو ہماری تک بندی پسند آئی جی خوش ہوا' ایک رات انجمن سادات امروہہ میں فیض صاحب کو مدعو کیا

گیا اور صرف ان ہی کا کلام سنا گیا۔ پذیرائی اور بے پناہ داد کا عالم دیکھ کر فیضؔ صاحب نے کہا 'اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ لوگ ہمارے کلام کو اتنا پسند کرتے ہیں تو ہم زیادہ محنت اور توجہ سے لکھتے'۔

ایک شام ڈاکٹر سرور اور پروفیسر ذکیہ سرور کی قیام گاہ پر احباب جمع ہوئے۔ فیضؔ صاحب کے علاوہ رئیس امروہوی، حبیب جالب، سیّد محمد تقی اور جون ایلیا موجود تھے۔ کراچی میں تازہ تازہ لسانی فسادات ہو چکے تھے اور یہی موضوع اس محفل میں گفتگو کا بن گیا۔ سب اپنا اپنا مؤقف بیان کرنے لگے۔ فیضؔ صاحب کا چہرہ غصے سے تمتمانے لگا لیکن اپنی شائستگی کو ختم کیے بغیر انہوں نے الفاظ پر زور دے کر بس اتنا کہا 'ہم چاہتے ہیں کہ اردو پورے پاکستان کی زبان بنے اور آپ اسے لالوکھیت تک محدود رکھنا چاہتے ہیں'۔

ایک محفل میں کسی نے فیضؔ صاحب سے ہمارا تعارف کرایا تو انہوں نے کہا 'ہاں بھئی ہاں یہ تو ہماری معنوی اولاد ہیں'۔ ایک اور محفل میں انہوں نے کہا 'کراچی میں میری دو آنکھیں ہیں ایک سحر انصاری اور دوسری محسن بھوپالی'۔

کرار نوری پر میں نے ایک مضمون 'غزل کی تمکنت' کے عنوان سے لکھا تھا۔ ان سے گاہے گاہے نشستیں ہوتی تھیں اسی اثناء میں، میں بلوچستان یونیورسٹی چلا گیا واپسی پر یہ مضمون مکمل کیا اور اس طرح دس برس میں یہ مضمون پورا ہوا۔ اس مضمون کے بارے میں فیضؔ صاحب نے یہ رائے دی کہ کرار نوری کی شاعری پر تو سحر انصاری نے گویا کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کر ہم نے بھی ازراہِ امتثال امر کچھ لکھ دیا ہے۔ *

فنونِ لطیفہ کے تمام شعبوں سے فیضؔ کو گہرا لگاؤ تھا۔ اس کا اظہار ان کے اسلوبِ زندگی میں صاف نظر آتا ہے۔ شاعری کا مطالعہ اپنے دیس اور بدیس تک پھیلا ہوا تھا، خود ایک منفرد اور مقبول شاعر تھے، عوامی زندگی اور عوام سے رابطے کو ضروری سمجھتے تھے، اسی لیے ادبی محفلوں اور مشاعروں میں خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے شرکت سے گریز نہیں کرتے تھے۔ تصویروں کی نمائشیں، موسیقی کی محفلیں انہیں بہت پسند تھیں۔ اکثر مشہور مصور علی امام کی انڈس گیلری میں بھی آ جاتے تھے جو ان کی قیام گاہ سے زیادہ دور نہیں تھی۔ شام کو یہاں فیضؔ کے علاوہ ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی، سیّد سبطِ

---

* کرار نوری کی شاعری پر فیضؔ صاحب کے مضمون کا متعلقہ حصہ ضمیمہ نمبر ۳ میں دیکھیے

حسن، صادقین اور بعض دوسرے دانشور اور مصور بھی رونق افروز ہوتے تھے۔ مصوری کے رجحانات اور مختلف تحریکوں پر بھی باتیں ہونے لگتیں۔ فیض کی شاعری میں لفظوں کی جو پیکر تراشی اور تمثالیں ملتی ہیں وہ ان کے شعورِ مصوری کو بطور خاص نمایاں کرتی ہیں۔ فیض نے مصوری کے بارے میں جتنی تحریریں بھی یادگار چھوڑی ہیں ان میں مصوری اور شاعری کا خوب صورت امتزاج نظر آتا ہے۔

ایک ملاقات میں علامہ اقبال کا تذکرہ دیر تک ہوتا رہا۔ میں نے کہا فیض صاحب اقبال کے کئی ناقدین ان کے کلام میں پائے جانے والے تضادات کی طرف اشارے کر چکے ہیں آپ کا اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟ انہوں نے جواب دیا بھئی اقبال ایک بہت ذہین، حساس اور تخلیقی ذہن کے مالک تھے ان کے عہد میں مقامی اور عالمی سطح پر جو کچھ رونما ہوتا اسے وہ اپنی شاعری میں اپنے احساس وفکر کے مطابق پیش کردیتے تھے تو یہ تضاد ان کے زمانے میں پیدا ہونے والے حالات کا ہے ان کی شاعری کا نہیں۔ اس خوب صورت اور مکمل جواب کے بعد مزید کچھ کہنے کی گنجائش ہی کہاں تھی۔

منظر اکبر نے سکھر میں ایک مشاعرے کا اہتمام کیا۔ اس میں فیض صاحب کے علاوہ شیخ ایاز، احمد فراز، سرور بارہ بنکوی، حمایت علی شاعر، محسن بھوپالی اور کئی دوسرے اہم شاعر شریک تھے۔ مشاعرہ بہت شاندار رہا۔ اس کامیابی سے خوش ہوکر منظر اکبر نے اگلے دن خیر پور میں مشاعرہ رکھ لیا۔ وہاں مشاعرے سے پہلے ے نوشی کا دور بھی چلا۔ فیض صاحب، احمد فراز اور شیخ ایاز ایک طرف بیٹھے اس شغل میں مصروف تھے میں بھی وہاں پہنچ گیا۔ کچھ دیر بعد سیاست اور صوبوں کے حقوق کے بارے میں موضوع چل نکلا اس بحث میں احمد فراز اور شیخ ایاز بہت زیادہ الجھ گئے۔ فیض صاحب انہیں روکتے رہے مگر بات بڑھتی چلی گئی۔ فیض صاحب اٹھ کر ذرا دور ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ میں نے اس فضا کو دوسرا رخ دینے کے لیے فیض صاحب سے ان کی بعض نظموں پر گفتگو شروع کردی۔

مشاعرے کا اہتمام خیر پور کے میئر کے نام سے موسوم 'فیض محل' میں ہوا۔ فیض صاحب اور احمد فراز کو آنے میں کچھ تاخیر ہوئی۔ اس وقت خیر پور ڈگری کالج کے پرنسپل خواجہ آشکار حسین تھے۔ سینئر شعرا کی عدم موجودگی میں انہیں صدر مشاعرہ بنا دیا گیا۔ مشاعرہ جب آخری مراحل میں تھا تو

فیضؔ اور فراز بھی آ گئے۔ اس وقت آشکار صاحب نے بہت اصرار کیا کہ فیضؔ صاحب صدارت کی سندھ سنبھالیں، لیکن وہ کسی طرح تیار نہ ہوئے یہاں تک کہ اپنا کلام بھی آشکار صاحب سے پہلے سنایا اور انہیں بحیثیت صدر اپنے بعد پڑھنے کی دعوت دی۔ کھانے کی میز پر ہم نے کہا فیض صاحب آپ نے اپنے نام سے 'فیض محل' بنالیا اور ہمیں خبر تک نہ ہوئی۔ فیضؔ صاحب مسکرا کر بولے ہمیں بھی یہاں آ کر پتا چلا کہ ہمارے نام کا بھی کوئی محل موجود ہے۔

جوشؔ صاحب کے بارے میں فیضؔ صاحب کا ایک مضمون جوشؔ کے تصورِ انقلاب کی بابت شائع ہوا تھا۔ اس سے بعض حلقوں کے یہ اندازہ لگایا کہ شاید ان میں کوئی اختلاف یا رنجش ہے۔ تاہم فیضؔ صاحب کے تمام تر طرزِ عمل سے کبھی یہ ظاہر نہیں ہوا۔ 'افکار' کے جوش نمبر کے لیے ان کے پیغام سے جوشؔ سے ان کی عقیدت اور جوشؔ کی اہمیت پوری طرح نمایاں ہے۔

مظفر احمد ضیا کلکٹر کسٹم تھے۔ خود بھی اچھے شاعر اور نفیس انسان تھے۔ وہ کیماڑی کے فلیٹ کلب میں ایک شاندار سالانہ مشاعرے کا اہتمام کرتے تھے۔ ایک ایسے ہی مشاعرے میں فیضؔ صاحب موجود تھے ان کے قریب حمایت علی شاعر، سرور بارہ بنکوی، محشر بدایونی، محسن بھوپالی، صہبا اختر اور دوسرے شعرا بیٹھے تھے۔ اتنے میں فیضؔ صاحب نے دیکھا کہ جوشؔ صاحب آ رہے ہیں۔ ہم سب کو متوجہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا 'ارے جوشؔ صاحب آ رہے ہیں چلیے ان کے قدم لیتے ہیں'۔ ہم سب فیضؔ صاحب کے ساتھ اٹھے اور جوش صاحب کو مسند تک لے آئے۔

جوشؔ صاحب کے انتقال کے وقت فیضؔ صاحب اسلام آباد میں تھے اور ان چند شخصیات میں شامل تھے جو اس موقع پر شریک ہوئے۔

جوزف اسٹالین کی شخصیت کئی متضاد عناصر کا مجموعہ تھی۔ اسی لیے اکثریت نے روس میں بھی اسے مسترد کیا لیکن کچھ لوگ آج بھی یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ روس کی سلامتی، دوسری عالمی جنگ میں اس کا تحفظ اور روس کی معاشی، صنعتی، سیاسی اور سائنسی ترقی اسٹالین ہی کے زمانے میں ہوئی لیکن روس کی ادبی تاریخ میں متعدد ادیب اور شاعر ایسے گذرے ہیں جنہوں نے اسٹالن اور اس کے عہد کو اپنی تحریروں میں تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اسی دور کے دو شاعر یوتوشینکو اور فرنزنسکی نوجوان لیکن باغی شاعروں کی حیثیت سے ابھرے۔ فیضؔ صاحب سے اس بارے میں بھی گفتگو رہتی تھی۔ وہ کہتے تھے بھئی وقت کے ساتھ ساتھ افراد اور پالیسیاں بھی بدلتی رہتی ہیں ان نوجوانوں نے

سائبیریا کے ناپسندیدہ واقعات سے گہرا اثر لیا۔ روس کے بزرگ شعرا اور ادیبوں سے تو ہماری یاد اللہ تھی لیکن یہ دونوں شاعر بھی ہمارے اچھے دوست ہیں۔ ایک دن میں نے فیض صاحب کی میز پر فرزنسکی کے شعری مجموعے 'AntiWorld' کی ایک جلد دیکھی۔ مجھے بھی یہ دونوں شاعر پسند ہیں میں نے کتاب اٹھا کر اِدھر اُدھر سے دیکھا۔ شاعر نے یہ کتاب اپنے دستخطوں سے فیض صاحب کو پیش کی تھی۔ میں نے پڑھنے کے لیے یہ کتاب لینی چاہی تو فیض نے کہا ’کچھ دن ٹھہر جایئے ہم اس کی کچھ نظموں کا ترجمہ کر رہے ہیں‘۔ کچھ دنوں بعد فیض نے اس کی ایک نظم کا ترجمہ دکھایا جو ان کے مجموعے میں ’ذرا سوچنے دو‘ کے عنوان سے شامل ہے۔ فیض نے ناظم حکمت، رسول حمزہ توف اور کئی دوسرے شعرا کے منظوم ترجمے کیے ہیں۔ اکادمی ادبیات کی ایک بین الاقوامی کانفرنس میں رسول حمزہ توف بھی آئے تھے۔ انہیں دیکھ کر مصافحہ کر کے اور مسکراہٹوں اور ہاتھوں کے اشاروں سے خیریت معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی۔ کیونکہ اس سے زیادہ کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ رسول حمزہ نہ انگریزی جانتے تھے نہ اردو اور ہم روسی اور داغستانی زبانوں سے ناواقف تھے، حالانکہ اس وقت جی چاہ رہا تھا کہ فیض صاحب کے بارے میں رسول حمزہ سے کچھ باتیں کریں۔

آسٹریلیا کی ایک خاتون اسٹیلا ڈرائی لینڈ شعبۂ اردو میں میری شاگرد ہوئیں۔ اس وقت ان کی عمر کوئی ستر برس کی تھی۔ ترقی پسند نظریات کی حامل تھیں۔ انہوں نے فیض صاحب کے بارے میں مجھ سے تفصیلی گفتگو کی کئی نشستیں رکھیں۔ فیض کے کلام کا انگریزی ترجمہ انہوں نے شائع کیا اور میری فراہم کردہ معلومات پر مبنی ایک دیباچہ بھی تحریر کیا۔ اسی طرح جاپان کے پروفیسر ہیرو جی کتادکا نے میری نگرانی میں غالبؔ اور فیض کی شاعری کے تراجم جاپانی زبان میں کیے۔ کلامِ فیض کے جاپانی ترجمے کا ایک نسخہ غالبؔ لائبریری میں موجود ہے جو کتادکا نے تحفتاً دیا تھا۔

فیض صاحب میں ایک خاص قسم کا حسِ مزاح بھی تھا جو موقع محل سے لطف انگیز ہو جاتا تھا۔ ۱۳ فروری ۱۹۷۱ء کو بیگم آمنہ مجید ملک نے اپنے پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس کالج کے میدان میں بڑے اہتمام اور سجاوٹ کے ساتھ فیض صاحب کی ساٹھویں سالگرہ کا بندوبست کیا۔ پُر ہجوم اجتماع میں ہر شخص فیض صاحب کو والہانہ انداز میں تہنیت پیش کر رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس روز کم سے کم ڈیڑھ دو سو خواتین نے فیض کو گلدستے پیش کیے اور ان کے رخسار یا پیشانی کو بوسہ دیا۔ فیض صاحب بہت ہشاش بشاش اس تقریب کے اندازِ پذیرائی کو دیکھ رہے تھے۔ جب ان سے

اظہارِ خیال کے لیے کہا گیا تو مائک پر آکر انہوں نے آمنہ باجی کا اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور پھر کہا کہ ہمیں آمنہ بہن سے ایک شکایت بھی ہے کہ انہوں نے اتنے بڑے مجمع کے سامنے یہ اعلان کر دیا کہ ہم سٹھیا گئے ہیں۔

گانے کی ایک محفل میں گلوکار نے کہا کہ فیض صاحب آپ کی ایک غزل پیشِ خدمت ہے۔ غزل سن کر فیض صاحب نے اس کو دس روپے ادا کیے۔ اس نے کہا فیض صاحب آپ کی ایک اور غزل پیش کرتا ہوں۔ غزل سن کر فیض صاحب نے دس اور دے دیئے۔ جان کار لوگوں نے کہا کہ فیض صاحب یہ غزلیں تو آپ کی نہیں ہیں۔ بولے ہمیں بھی معلوم ہے مگر بیس روپے میں دو غزلیں کیا بری ہیں۔

سابق مشرقی پاکستان میں جو دل خراش واقعات پیش آئے۔ جس طرح اس وقت کی حکومت نے جو فیصلے کیے۔ فوج کشی اور قتل و غارت گری ہوئی اس کے بعد بنگلہ دیش معرضِ وجود میں آ گیا۔ اس وقت فیض صاحب نے کئی نظمیں اور غزلیں اُن حالات سے متاثر ہو کر لکھیں۔ یہ دو نظم میں نے کہیں شائع ہونے سے پہلے فیض صاحب کی میز پر دیکھی تھی۔

حذر کرو مرے تن سے یہ سم کا دریا ہے

اس وقت ترقی پسندوں کو خاص طور پر نشانۂ تنقید بنایا جا رہا تھا اور چونکہ حکومتِ وقت نے یہ تاثر دیا تھا کہ اس علیحدگی میں روس کا بڑا ہاتھ ہے تو بطورِ خاص فیض صاحب اور ایلس فیض کو دھمکی آمیز فون آنے لگے اور فیض صاحب سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ لینن انعام واپس کریں۔ اس سلسلے میں کنٹرک ہال (بالمقابل ریڈیو پاکستان) میں ایک بڑا جلسہ منعقد ہوا۔ فیض صاحب نے اپنی تقریر میں پوری صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد یہ کہا کہ عالمی سیاست میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں بعض اوقات دوست ملک بھی حریفانہ رویہ اختیار کر سکتے ہیں۔ روس کے پورے ماضی کو تو ہم اپنے تاریخی روابط سے الگ نہیں کر سکتے لیکن وہاں کی موجودہ حکومت کے بعض فیصلوں سے اختلاف ممکن ہے۔ اس کا ظہار بھی ہمارے یہاں ہر سطح پر ہو رہا ہے۔ البتہ جہاں تک لینن انعام کا تعلق ہے یہ ایک عظیم ہستی کے مقدس نام سے منسوب ہے جس نے دنیا کے مظلوم طبقات کے لیے ایک مثالی انقلاب برپا کیا جس سے متاثر ہو کر دنیا کی بڑی آبادی نے اپنے اپنے حالات کے مطابق انقلابی تحریکیں چلائیں اور کامیاب رہی لہٰذا لینن انعام میں واپس نہیں کروں گا۔

فیض کی اس جرأت اور دلیری پر زوردار تالیاں بجیں اور اندازہ ہوا کہ وقت آنے پر فیض کی یہ بظاہر نظر نہ آنے والی طاقت کس طرح اپنا ظہور کرسکتی ہے۔

فیض صاحب ملاقاتوں کے دوران بعض منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے پر بھی توجہ دیتے تھے۔ ایک بار انہوں نے کہا کہ میرا ارادہ اردو ادب کی تاریخ لکھنے کا ہے جو ہماری روایتی تاریخوں سے مختلف ہوگی۔ کیونکہ post colonial ماحول میں اپنے غلامی کے دور اور انگریزوں کی اپنی حکمت عملی کو سمجھنے کے کئی زاویے ذہن میں آرہے ہیں۔ فورٹ ولیم کالج اور انجمن پنجاب جیسے اداروں کی تحلیل کے مقاصد کو نئے تناظر میں دیکھا جاسکتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اس کا سارا کتابی اور حوالہ جاتی مواد آپ فراہم کریں گے اور ہم ہر ماہ یا پندرہ دن میں کسی ایک موضوع پر لیکچر دیں گے جنہیں بعد میں کتابی صورت میں مرتب کیا جاسکتا ہے۔

میں بہ سروچشم اس خدمت کے لیے تیار ہوگیا لیکن ۱۹۷۱ء کے واقعات نے فیض کو کراچی کی سکونت ترک کرنے پر مجبور کردیا اور یہ منصوبہ ادھورا رہ گیا۔

اسی طرح انہوں نے ایک دن کہا کہ کسی ادارے، غالباً یونیسکو کی طرف سے یہ پیش کش ہوئی ہے کہ فیض صاحب زمانہ قدیم سے دورِ حاضر تک اردو شاعری کا ایک انتخاب کریں اور اس پر ایک مقدمہ تحریر کریں۔

نول کشور کے مطبوعہ کلیات پر اور 'کلیاتِ سودا' کے اشعار پر انہوں نے نشان لگادیئے جنہیں میں نے الگ کاغذوں پر لکھ کر ایک مسودہ تیار کرکے فیض صاحب کے سپرد کردیا۔ تاہم اس کا بھی کوئی مصرف سامنے نہ آسکا۔

جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں فیض صاحب جلاوطنی کی زندگی بسر کررہے تھے اور پاکستان میں اپنی آمد کو بوجوہ ٹال رہے تھے۔ لیکن اسی اثناء میں گورنر سندھ رسول بخش تالپور نے دو تین دن کے لیے فیض صاحب کی پاکستان میں آمد کو ممکن بنادیا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر شمیم کاظمی اور ان کے ہمکاروں نے ایک عمدہ مشاعرے کا اہتمام کرڈالا۔ مدت بعد انتہائی نازک حالات میں فیض صاحب کو سننے اور ان سے گفتگو کا موقع ملا ہر شخص شاد و فرحاں تھا اسی میں جمیل الدین عالی نے اپنی غزل سناتے ہوئے۔ یہ مصرعہ پڑھا

نقدِ سخن میں یہ آیا ہے دو ہے پڑھنے والا تھا

اور دو تین بار فیضؔ صاحب کو مخاطب کر کے ترنم سے یہ مصرعہ دہراتے رہے فیضؔ صاحب نے مسکرا کر کہا تو بھئی کیا غلط آیا تھا۔

فیضؔ صاحب اور حفیظ جالندھری سرکار کی طرف سے روس کے خیر سگالی دورے پر بھیجے گئے تھے۔ واپس آ کر حفیظ جالندھری نے ایک رسالے میں فیضؔ کے خلاف لکھنا شروع کر دیا۔ محمد حسین عطا کے صاحبزادے نجم الحسن عطا کی شادی کی تقریب عطا صاحب کے ہوٹل پام گرو میں منعقد ہوئی۔ اس میں فیضؔ صاحب، علی احمد تالپور اور کئی اہم شخصیتیں شریک تھیں۔ میں نے یوں ہی گفتگو کا کوئی سلسلہ پیدا کرنے کے لیے فیضؔ صاحب سے کہا کہ صاحب یہ حفیظ جالندھری آپ کے خلاف بہت کچھ زہر اُگل رہے ہیں، آپ اس کا کوئی جواب تو دیجیے تا کہ ریکارڈ درست رہے۔

فیضؔ صاحب نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے مسکرا کر کہا ارے آپ یہ تحریریں پڑھتے ہیں؟

میں نے جواب دیا 'آپ کے تذکرے کی وجہ سے پڑھ لیتے ہیں' پھر سنجیدہ لہجے میں فیضؔ صاحب نے کہا ایسی تحریروں کا کوئی ریکارڈ ہی نہیں ہوتا تو پھر درست یا نادرست کا کیا سوال۔ لکھنے دیجیے انہیں۔ البتہ آپ ایسی تحریروں پر اپنا وقت ضائع نہ کیجیے۔

ایک مرتبہ فیض صاحب ماسکو سے واپس آئے۔ ملاقات کے دوران بتایا کہ بھئی اب کے ہم ماسکو گئے تو وہاں کی پیٹرس لومبا یونیورسٹی میں ہمیں لے جایا گیا اور اردو پڑھنے والے طالب علموں کی کلاس سے متعارف کرایا گیا۔ ہم نے محسوس کیا کہ اردو پڑھانے کا خاطر خواہ انتظام نہیں۔ ہم نے انہیں مشورہ دیا کہ کسی بہتر استاد کا انتخاب کیجیے۔ اس وقت ہمیں آپ کا خیال آیا۔ دیکھیے جلد ہی کچھ پیش رفت ہوگی۔

میں بے حد خوش اور متاثر ہوا کہ فیضؔ صاحب نے از خود اس طرف توجہ دی۔ ان ہی دنوں میں نے ابنِ انشاء سے اس بات کا ذکر کیا تو کہنے لگے یقیناً فیضؔ صاحب کے ذہن میں آپ کا نام آیا ہوگا۔ کچھ نہ کچھ بات بنے گی ضرور۔

میں نے ایک آدھ بار فیضؔ صاحب کو یاد دہانی کا خط لکھا تو جواب میں انہوں نے تحریر کیا:

> 'آپ کے خط کی رسید بھیجنے میں تاخیر ہوئی جس کا تاسف ہے، سرکاری کاغذات کی بھرمار میں کہیں ادھر اُدھر ہو گیا تھا۔ ویتنام کے بارے میں شریک تہنیت ہوں۔ یہ حق و انصاف کی یقیناً بہت عظیم فتح ہے۔

اس بات سے مسرت ہوئی کہ آپ میری تجویز سے متفق ہیں۔ میں اپنی جانب سے سلسلۂ جنبانی شروع کردوں گا لیکن دفتری کارروائیاں اکثر طویل اور صبر آزما ہوتی ہیں اس لیے نتائج کے لیے غالباً کافی وقت درکار ہوگا۔ اس لیے فی الحال آپ صبر کا دامن مضبوطی سے تھامے رہیے اور اس کے ثمر کا انتظار کیجیے۔ غالباً جلد کراچی میں ملاقات ہوگی۔'*

مرزا ظفر الحسن، محسن بھوپالی اور عالم تاب تشنہ کی دلچسپی اور معاونت سے میرے پہلے شعری مجموعے 'نموذ' کی اشاعت کا منصوبہ بننے لگا۔ فیض صاحب تک یہ بات پہنچی۔ ایک دن کہنے لگے 'بھئی ہم نے سنا ہے آپ کا کوئی شعری مجموعہ آنے والا ہے۔ کہیے تو ہم اس پر کچھ لکھ دیں۔' میرے تو کانوں کو یقین نہیں آیا۔ میں نے انتہائی عقیدت سے عرض کیا کہ صاحب اس سے بڑی سعادت کیا ہوسکتی ہے۔ میرے لیے فخر کا باعث ہوگا آپ کا کچھ فرما دینا۔

فیض صاحب کے ارشاد کے مطابق میں نے مسودہ انہیں دے دیا۔ اس کے بعد وہ لاہور منتقل ہوگئے۔ پھر ماسکو اور لندن کے قیام کی شکل پیدا ہوگئی۔ ایک دن میرے نام فیض صاحب کا خط آیا کہ ہم لندن سے واپسی پر کراچی آرہے ہیں۔ ۲ بجے دن کو آپ سروسز کلب میں مل لیجیے۔

میں وقت مقررہ پر پہنچا وہاں ڈاکٹر عالیہ امام بھی خیر مقدم کے لیے موجود تھیں۔ پورٹیکو میں فیض صاحب کی کار آکر رکی۔ اُترے تو ان کے ہاتھ میں ایک بریف کیس تھا۔ اسے کھول کر مسودہ مجھے دکھایا اور کہا کہ سارے سفر میں یہ میرے ساتھ رہا ہے۔ میں نے پڑھ لیا ہے کل صبح دس بجے خدیجہ بیگم کے ہاں سے میری رائے لے لیجیے گا۔ فیض صاحب نے محبت اور قدر شناسی کے جو الفاظ تحریر کیے وہ میرے لیے سرمایۂ افتخار ہیں۔

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے **

فیض صاحب سے آخری ملاقات انکی وفات سے چند ماہ قبل کراچی میں ہوئی۔ کرار نوری کی کتاب 'میری غزل' کی رسم تعارف کی صدارت کے لیے فیض صاحب لاہور سے آئے تھے۔

---

* یہ خط فیض صاحب کی کتاب 'متاعِ لوح و قلم' (کراچی، دانیال، ۱۹۷۳ء) میں بھی شامل ہے۔

** 'نموذ' کے بارے میں فیض صاحب کی تحریر کے لیے دیکھیے ضمیمہ نمبر ۴

تقریب پریس کلب میں تھی اور انہیں بیگم آمنہ مجید ملک کی قیام گاہ سے پریس کلب لانے کا کام میرے سپرد تھا۔ میں نے جیسے ہی فیض صاحب کو دیکھا معانقہ اور مصافحہ کیا اور مجھ میں خوشی اور حیرت کے ملے جلے جذبات پیدا ہو گئے۔ خوشی اس بات کی کہ فیضؔ صاحب سے ملاقات ہو رہی ہے اور حیرت یہ دیکھ کر کہ کچھ عرصے تک فیضؔ صاحب جس طرح فربہی کا شکار ہو گئے تھے اور سارا جسم متورم معلوم ہوتا تھا اس میں یکلخت کمی آ گئی تھی اور وہ ہلکے پھلکے سلم اور چاق و چوبند نظر آ رہے تھے۔

کار میں بیٹھنے کے بعد میں نے اپنا تبصرہ اور مسرت ان تک پہنچائی، بولے 'ہاں آپ ٹھیک کہتے ہیں اصل میں اس بیماری کا سبب ہم نے ختم کر دیا۔'

میں نے پوچھا: کہ کیا وسکی چھوڑ دی؟

بولے: 'نہیں سگریٹ چھوڑ دی۔'

میں نے پوچھا: وہ کیوں اور کیسے؟

کہنے لگے: 'بھئی ہم جب برطانیہ یا روس جاتے ہیں تو اپنا میڈیکل چیک اپ ضرور کراتے ہیں۔ اس بار ماسکو کے ایک ڈاکٹر نے ہم سے کہا کہ آپ کی جو کیفیت اس وقت ہے وہ سگریٹ نوشی کا نتیجہ ہے۔ پھر اس نے تفصیل سے پوری تھیوری سمجھائی کہا کہ سگریٹ میں نکوٹین یا اس کے کاغذ کا کاربن کوئی معنی نہیں رکھتا اصل چیز یہ ہے کہ ہر انسان ایک bio rhythem لے کر پیدا ہوتا ہے۔ یہ ردھم یا آہنگ اس کے سانس لینے کے عمل، قلب کی دھڑکن اور خون کی گردش میں شامل ہوتا ہے، جب آپ تیس چالیس برس تک سگریٹ کے کش لگاتے ہیں تو سانس کا یہ ردھم بگڑ جاتا ہے اور انسان دمے یا سانس کی بیماری کا شکار ہو جاتا ہے۔ فیضؔ صاحب مسکراتے ہوئے بولے کہ 'یہ بات ہماری سمجھ میں آ گئی اور ہم نے سگریٹ چھوڑ دی اور نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔'

فیضؔ۔ ایک نثر نگار

شاعری کی طرح فیضؔ کی نثر بھی کمیت میں زیادہ نہیں ہے۔ ان کے مضامین کا ایک مجموعہ 'میزان' کے نام سے شائع ہوا ہے اس کے علاوہ شعری مجموعوں کے دیباچے اور چند اور مضامین ہیں جو فیضؔ نے اپنے حالیہ دورہ انگلستان و یورپ کے دوران پاکستان کے بعض روزناموں اور ہفت روزوں کے لیے سپردِ قلم کیے تھے۔ یہ مضامین مختصر ہیں۔ لیکن تنوع کے اعتبار سے تقریباً تمام اہم موضوعات پر محیط ہیں۔ ان مضامین میں فکر اور اسلوب کے وہ تمام تر اجزاء موجود ہیں جن کی روشنی میں فیضؔ کی شخصیت اور مسائل کی جانب ان کی توجہ کے براہ راست زاویے نظر آتے ہیں۔ فیضؔ نے 'میزان' کے دیباچے میں چند سطریں لکھ کر ان مضامین کی نوعیت واضح کردی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ان میں ادبی مسائل پر سیر حاصل بحث نہیں ہے اور اس میں سخن علماء سے نہیں بلکہ عام پڑھنے لکھنے والوں سے ہے۔ جو ادب کے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ فیضؔ کے ان مضامین میں رسمی اور روایتی تنقید کا انداز نہیں ملتا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ ان میں سے بیشتر مضامین اب سے بیس پچیس برس پہلے جوانی کے دنوں میں لکھے گئے تھے۔ یہ اس لیے وقیع اور اہم ہیں کہ بنیادی طور پر فیضؔ کو 'ان تنقیدی عقائد سے اب بھی اتفاق ہے۔' دراصل یہ مضامین ایک ذمے دار اور سنجیدہ شاعر کے اس ذہن کی پیداوار ہیں جس میں ادب، معاشرے اور زندگی کے بہت سارے مسائل ابھرتے ہیں۔ جس کا منصب شعر گوئی اور شعر فہمی کے علاوہ زندگی کے بعض اہم سماجی اور فلسفیانہ مسائل پر غور و فکر کرنا بھی ہے اور شاعر کے قلم سے نثر غالباً اسی صورت میں صفحہ قرطاس پر جلوہ فرما ہوتی ہے جب وہ اپنے بعض خیالات کو نظم میں من و عن پیش کرنے میں ناکام

رہتا ہے۔ تخیل اور تعقل سے آراستہ اور ایجاز و اختصار کے پیراہن میں ملبوس نظر آنے والے اشعار جب فکر و عمل اور مسائل کے ہجوم کو دیکھ کر اظہار کے لیے وسعت بیاں کے طالب ہوتے ہیں تو تحریر کی وہ صنف معرض وجود میں آتی ہے۔ جسے یونان میں 'حرف برہنہ' کہا جاتا تھا۔ وہ ساری قطعیت اور معروضیت اس حرف برہنہ میں سمٹ آتی ہے۔ جسے شعر کی حجاب اندر حجاب معنویت سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔

فیض کے نثری مضامین کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک کامیاب نثر نگار کی طرح کسی موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے اس موضوع کے تمام پہلوؤں پر غور و خوض کیا ہے۔ اپنے ذہن میں جزئیات اور تمام باریک سے باریک تفصیلات کو مرتب کیا ہے۔ اور اس کے بعد خیال کو تحریر کے میکانکی عمل سے گذارا ہے۔ انفرادی زاویوں کو اجاگر کرنے کے لیے فیض کو اپنے ذہن کے عکس بین کے سیکڑوں زاویے بدلنے پڑے ہونگے تا ایں کہ خیالات کے رنگ برنگے شیشے کے ٹکڑوں کی ایک ایسی انوکھی، فطری اور بیساختہ ترتیب عمل میں آ گئی کہ اس پر نگاہ ڈالتے ہوئے آپ سرسری نہیں گزر سکتے۔ اس عمل کے بعد معرض تحریر میں آنے والی نثر مصنف کے خیال کی رو الفاظ اور آپ کی نگاہوں کے ساتھ ساتھ سفر کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ آپ خود کو خیال کے تمام نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے محسوس کرتے ہیں۔ تحریر میں یہ بات اس وقت پیدا ہوتی ہے جب الفاظ کے بجائے خیال کی اہمیت کو محسوس کر کے موضوع کی اچھی طرح تطہیر کر لی گئی ہو۔ فیض اس عمل کی اہمیت سے بخوبی واقف ہیں اور انہوں نے خیال کے مسئلے پر ہر پہلو سے غور کیا ہے اور اس کو وہ تحریر کی اثر آفرینی اور بے ساختگی کا بنیادی عنصر سمجھتے ہیں۔ خیال اور تشبیہ و استعارے کی وضاحت انہوں نے یوں کی ہے کہ 'شاعر یا لکھنے والے کی منزل تو اس کا مضمون یا خیال ہے۔ اور اگر یہ منزل بالکل بنجر ہے تو راستے کی رنگینی اسے دلفریب نہیں بنا سکتی، پس تشبیہ و استعارہ شعر یا ادبی تحریر میں کوئی مقصود نہیں۔'

تحریر کے بارے میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ آسان الفاظ استعمال کرنے سے تحریر قابلِ فہم اور سلیس ہو جاتی ہے۔ یہ نظریہ دراصل حقیقت سے بہت دور ہے۔ آج کل یہ رجحان عام ہے کہ بیشتر فارسی یا عربی کے الفاظ پر مشتمل عبارت کو مشکل اور گنجلک سمجھ لیا جاتا ہے حالانکہ خود فیض کے الفاظ میں یہ ضروری نہیں ہے کہ 'جہاں کوئی فارسی ترکیب آئی تحریر میں پیچیدگی پیدا ہو گئی۔ اس کے تو

یہ معنی ہوئے کہ ہندی بھاشا میں آج تک جو کچھ لکھا گیا ہے بہت سلیس ہے اور فارسی میں تو گویا خاقانی اور بیدل کے سوا کوئی پیدا نہیں ہوا‘ فیض اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ بنیادی چیز خیال کی صفائی ہے۔ عبارت معلق اور پیچیدہ بے لطف اور سپاٹ اسی صورت میں ہوتی ہے جب لکھنے والے کے ذہن میں خیال الجھا ہوا ہو۔ تحریر کی روانی کے بارے میں فیض کا یہ کہنا بالکل دُرست ہے کہ روانی ’معانی کی موزوں نشست کا مسئلہ ہے‘ الفاظ کے خارجی تسلسل کی پیدائش نہیں، ان کی داخلی ہم آہنگی کا نتیجہ ہے‘ اب اس پورے موقف کی تفصیل جاننے کے لیے یہ عبارت پیش نظر رکھئے اس میں آپ کو ایک ایسے نثر نگار کا سوچتا ہوا ذہن ملے گا۔ جسے اپنے قاری تک واقعی کچھ پہنچانا ہے اور جس نے ان خیالات کے نشیب وفراز کا فشار برداشت کیا ہے جو ایک قدرتی چشمے کی طرح سطح سنگ کو توڑ کر باہر نکلنے کے لیے بیتاب ہیں‘

’اگر خیال لکھنے والے کے ذہن میں صاف ہے اور اس نے اسے سہولت سے آپ تک پہنچا دیا ہے تو اس کی تحریر میں فارسی کی ہی بجائے لاطینی تراکیب ہوں تو بھی ہم اسے سلیس ہی کہیں گے، البتہ امکان یہ ہے کہ اگر الفاظ زیادہ مانوس ہوں تو مضمون زیادہ آسانی سے ہم تک پہنچے گا...... لیکن یہ امکان ہے، شرط نہیں ہے، سلاست اور روانی کے متعلق ہمارے تنقیدی خیال میں نقص یہ ہے کہ ہم نے مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم کر دیا ہے۔‘

فیض مقدم کو مقدم اور مؤخر کو مؤخر کی حیثیت سے پیش کرنے کا ملکہ رکھتے ہیں اس لیے ایک اچھے نثر نگار کی طرح ان کی تحریر میں تفصیل الفاظ، قطعیت، معروضیت اور تخلیقی تصرف بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ایک جگہ موضوع اور طرزِ ادا پر بحث کرتے ہوئے الفاظ اور معانی کی نسبت سے انہوں نے خیال اور موضوع کی اہمیت ظاہر کی ہے ’اچھے ادب میں موضوع اور طرز ادا اصل میں ایک ہی شے کے دو پہلو ہوتے ہیں اور ان میں دوئی کا تصرف غلط ہے، الفاظ اور ان کے معانی الگ الگ اور یکے بعد دیگرے نہیں، ایک ساتھ اور بیک وقت

ہم تک پہنچتے ہیں، اگر کسی کے پاس کہنے کے لیے کوئی بات نہیں ہے تو
اس کا طرزِ بیان کیا کرے گا۔ اور اگر اسے بیان پر قدرت نہیں تو
ہمیں یہ کھوج کیسے ملے گا کہ حضرت کیا کہنا چاہتے تھے۔'

فیض نے اپنے مضامین میں ہر جگہ یہ کوشش کی ہے موضوع کو اپنے منفرد اسلوب کے ذریعہ ان حضرات تک پہنچا دیں جو اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس کوشش میں ان کا انداز بندھے تکے اصولوں کا پابند نہیں ہے۔

فیض نے نثر میں اپنی تخلیقی ذہانت سے پورا پورا کام لیا ہے۔ لیکن نثر 'شعری نثر' ہونے کے بجائے معروضی اور تخلیقی نثر ہے اصولوں اور مسائل کی بحثوں میں بھی انہوں نے اپنا جمالیاتی شعور برقرار رکھا ہے۔ ویسے بھی عام طور پر بعض اہم ناقدوں اور نثر نگاروں کی رائے ہے کہ ایک اچھا شاعر اچھی نثر اور اچھی تنقید لکھ سکتا ہے۔ تعصب اور جانبداری کو بالائے طاق رکھ کر دیکھا جائے تو یہ بات خاصی واضح ہے۔ دراصل وجدان اور منطق تخیل اور تعقل، جذبے اور تجربے، مشاہدے اور محاکے کے تمام نشیب و فراز کا ایک تخلیقی ذہن کو غیر تخلیقی ذہن کے مقابلے میں زیادہ تجربہ ہوتا ہے۔

کولرج، میتھیو آرنالڈ اور ٹی۔ ایس ایلیٹ وغیرہ سے قطع نظر خود اردو میں غالب، حالی، شبلی اور اقبال سے لے کر خورشید الاسلام، آل احمد سرور، میراجی، عزیز حامد مدنی، انجم اعظمی اور جون ایلیا نے نثر کے جمالیاتی اور تخلیقی ادب کو اپنے اپنے انداز میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

(اردو میں 'خوبصورت نثر' کی ایک اور مثال محمد حسین آزاد، مہدی الافادی، سجاد انصاری، ابوالکلام آزاد اور میر ناصر علی دہلوی وغیرہ کی تحریریں ہیں، لیکن ان حضرات نے نوک پلک سے درست انشا پردازی اور زبان کے ظاہری رنگ و روپ پر اس قدر توجہ دی ہے کہ معروضیت اور قطعیت مفقود ہو کر رہ گئی۔ اس اعتبار سے ان حضرات کو 'رومانوی نثر نگار' کہنا زیادہ صحیح ہے۔ کسی کی گپ پر وحی کا گمان ہونا، ممکن ہے تحریر کا کوئی خاص وصف ہو لیکن جہاں تک کامیاب نثر کا تعلق ہے اس میں وحی کو وحی اور گپ کو گپ ہی معلوم ہونا چاہیے۔)

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ فیض نے نثر لکھتے وقت اپنی تخلیقی ذہانت سے پورا کام لیا ہے۔ وجدان سے خیال اور الفاظ تک ایک تخلیقی ذہن کو کن کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اس کی تصویر فیض نے کمال خوبی سے پیش کی ہے۔ اور اس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ تخلیقی اور غیر تخلیقی ذہن میں ہم کیوں امتیاز کرتے ہیں۔ اگر کسی غیر تخلیقی ذہن سے یا ایسے تخلیقی ذہن سے جس نے خود اپنی 'اقلیم فن کا سفر بھی مکمل نہ کیا ہو، دریافت کیا جائے کہ خیال اور جذبہ اپنی تجریدی نوعیت سے گزر کر مخصوص الفاظ کے قالب میں منتقل ہو کر دوبارہ اثر انگیزی کی منزل تک پہنچنے میں کن کن مراحل سے گزرتا ہے تو شاید وہ اس کا یہ جواب دے کہ تخلیقی عمل کا تجزیہ ناممکن ہے۔ وجدانی طریق کار کے بارے میں صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر خیال اپنی ایک تصویر رکھتا ہے جو لفظ، رنگ یا خطوط کی صورت میں کاغذ کینوس یا پتھر پر منتقل ہو جاتا ہے۔

بعض سنجیدہ فکر شاعروں نے خیال اور جذبے بلکہ خود تخلیقی عمل کی بہت موثر انداز میں تصویر کشی کی ہے اور تجرید کو تجسیم کی منزل پر لانے میں کامیاب رہے ہیں۔ ایک ایسی ہی کامیاب کوشش فیض کی ایک ایسی تحریر میں ملتی ہے۔ اس میں سب سے پہلے انہوں نے تخیل کی وضاحت کی ہے کہ وہ تخیل بجائے خود ایک تخلیقی عمل ہے خواہ فن کی صورت میں اس کا اظہار ہو یا نہ ہو۔ اس عمل کو ہم تخلیقی اس لیے کہتے ہیں کہ اس کے توسط سے جو ذہنی تجربہ مرتب ہوتا ہے اس کی صورت اور ماہیت اسی عمل سے ایجاد ہوتی ہے اور خارجی یا داخلی دنیا میں اس کی اور کوئی نظیر نہیں ملتی'...... تخیل کسی مخصوص مشاہدے، یاد، تصور یا جذبے کا سا منفرد اور الگ تھلگ ذہنی عمل نہیں ہوتا بلکہ ان سب سے مرکب ایک کیفیت ہے جو ان سب اجزا میں شامل اور جس میں یہ سب اجزا شامل ہوتے ہیں'

اس نظری بحث کی مزید تفہیم کی غرض سے فیض نے مصحفی کا ایک شعر منتخب کیا ہے جس کی تشریح کرتے ہوئے اپنے خاص اسلوب میں انہوں نے اپنے موقف کی وضاحت کی ہے۔

چلی بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہرے گا!

جرس، غنچہ، صدا، نسیم، قافلہ، بہار اپنی فطری اور حقیقی صورت میں شاعر کے مشاہدے سے متعلق ہیں۔ شاعر کے ذہن میں ان کے تصور کا وجود اس کی یادداشت سے وابستہ ہے، بہار کے حسن اور پائیداری سے شیفتگی اور سرمستی کی تلقین میں فکر اور جذبہ دونوں کا امتزاج ہے، الفاظ کا انتخاب

نشست اور صوتی ترتیب شاعر کی صناعت اور فنی اکتساب کا اظہار ہیں لیکن ان میں سے کوئی جز دبھی بجائے خود مصحفی کا شعر نہیں ہے۔ وہ عمل جس سے شاعر نے غنچے کو جرس، غنچے کے چٹکنے کو اس جرس کی صدا، تختہ گل کو چھنکتا ہوا قافلہ اور چلتی ہوا کو مسافر بنا کر یہ کارواں اپنی منزل کو روانہ کیا ہے۔ تخیل ہی کا عمل ہے، اس عمل سے پہلے غنچے اور جرس کے تصورات یا images میں رشتہ پیدا ہوا، اس رشتے سے غنچے کے چٹکنے سے جرس کی صدا کا ناتا بندھا ایسے بہت سے غنچے مل کر نو بہار بنے، جرس اور غنچے کے تخیلی رشتے کی ایک کڑی اس بہار سے جا ملی اور اسے قافلہ بنا دیا اور پھر یہی زنجیر نسیم کو مسافر کے پیکر میں کشاں کشاں ساتھ کھینچ لائی۔ شاعر کے تخیل نے پہلے اپنے مشاہدے اور یادداشت سے یہ سب تصورات چھانٹ کر الگ کیے، پھر ان میں ایسے بنتے ایجاد کیے جن کا عالم موجودات میں کوئی وجود نہیں، اس شیرازہ بندی کے بعد ایک نیا مجموعہ مرتب کیا اور اس کے گرد وپیش ان جذبات کی فضا قائم کی، جو مشاہدے اور یادداشت نے نجانے کب سے ان تصورات سے وابستہ کر رکھی تھی، تب کہیں جا کر ان سب عناصر اور ان کے مجموعے کو وہ الفاظ نصیب ہوئے جو مصحفی کا شعر ہے۔'

تخلیق اور تخیل کے رشتوں کی وضاحت سے قطع نظر اس طویل اقتباس میں فیض کی کئی حیثیتیں سامنے آتی ہیں۔ قاری، شاعر، مفکر اور نثر نگار۔ ان سب کی ایک مخصوص سطح ہے اور ان سب کی آمیزش اور فیض کی شخصیت کے پرتو سے پیدا ہونے والی چیز وہ عبارت ہے جس میں تخلیقی مطالعے کا عکس اور تخلیقی نثر نگاری کا عنصر منفرد انداز میں کارفرما نظر آتا ہے۔

ادب کی نظری اور عملی تنقید پر بھی فیض نے غور وخوض کیا ہے۔ ان موضوعات پر انہوں نے ایک خاص انداز سے قلم اٹھایا ہے اور ایسی باتیں پیش کی ہیں جو پیشہ ور ناقدین کی تحریروں کے مطالعہ یا اردو تنقید کے مزاج پر غور وفکر کرنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً ہماری زبان میں تنقید کے اصول کس طرح مرتب کیے جاتے ہیں۔ الفاظ اصطلاحات اور محاکے کا کیا انداز ہے کہ ہماری مروجہ تنقید سے تنقید کی ضرورت پوری ہوتی ہے اور اس طرح کے بہت سے سوالات خود فیض نے اپنے مضامین میں بیان کیے ہیں اور اپنے ایک جداگانہ نقطہ نظر سے ان کے جواب بھی دیے ہیں اس طرح ان کے تنقیدی مضامین میں خود ان کے تنقیدی نظریات بھی سامنے آگئے ہیں جن کے بارے میں فیض کا کہنا ہے کہ 'ان تنقیدی عقائد سے مجھے اب بھی اتفاق ہے۔'

فیض نے 'ہماری تنقیدی اصطلاحات' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے۔ جس کا آغاز ان فقروں سے ہوتا ہے:

'...... ایک تنقید نگار کو جہاں ہماری زبان سے اور بہت سی شکایات ہیں وہاں ایک شکایت یہ بھی ہے کہ اسے حسب ضرورت تنقیدی اصطلاحات نہیں ملتی۔ یہ زبان کے عجز پہ طعن نہیں ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہماری زبان میں تنقیدی لغت موجود ہی نہیں۔ یا اس میں ایسے الفاظ کی کمی ہے جو مختلف تنقیدی تصورات کو ادا کرسکیں، اس شکایت کے معنی صرف اس قدر ہیں کہ ہمارے ہاں تنقیدی الفاظ و تراکیب کے استعمال میں اختلاف اور ابہام موجود ہے۔ ان کی اصطلاحی اہمیت زائل ہوگئی ہے...... دوسری بات یہ ہے کہ ان اصطلاحات کی فنی یا قدری اہمیت بہت واضح نہیں۔ ہم نے ابھی تک یہ پرکھنے کی کوشش نہیں کی کہ ہمارے مجوزہ محاسن و معائب محاسن و معائب ہیں بھی یا نہیں۔ اگر ہیں تو کیوں ہیں۔ مثلاً جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں شاعر کے کلام میں سلاست ہے، روانی ہے، خلوص ہے، جدت ہے وغیرہ وغیرہ تو نہ ہی اس شاعر کے کلام کی خصوصیات واضح ہوتی ہیں اور نہ اس کے کلام کے حسن و قبح کا پتہ چلتا ہے۔'

یہ بات ہماری زبان کے بیشتر تنقیدی مضامین پر صادق آتی ہے۔ کسی ایک لفظ یا اصطلاح کا مفہوم ہماری تنقید میں متعین نہیں ہے۔ چند ایک جدت طراز نقاد دو چار اصطلاحیں سب سے ہٹ کر ایجاد کرتے ہیں تو بقیہ حضرات اپنے بے شمار مضامین میں جا و بے جا طور پر انہیں استعمال کر کے ان کی اہمیت و اثر آفرینی کی قوت کو کم کر دیتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ فیض نے تنقیدی مضامین میں مروجہ تنقیدی اصطلاحوں سے اور مسائل پر قلم اٹھاتے ہوئے سیاسی اور سماجی اصطلاحوں کے استعمال سے گریز کیا ہے۔ یہی خوبی فیض کی گفتگو میں بھی پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے موقف کی وضاحت کے لیے سرمایہ داری نظام، جاگیرداری نظام، استحصال، پرولتاری، بورژوازی، آمریت، فاشیت وغیرہ قسم کی پٹی پٹائی فرسودہ اصطلاحیں استعمال نہیں کرتے ہیں۔ چنانچہ علمی

موعظت کے بے روح اظہار کے بجائے روزمرہ زندگی سے الفاظ اور اصطلاحیں اخذ کر کے اپنی بات کو زیادہ موثر بنانے کے فن سے فیض بخوبی واقف ہیں، اسی لیے ان کی تحریر موثر اور شارع عام سے ہٹی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ایک مشینی انداز گفتگو کے بجائے ان کی تحریر اور تقریر میں سیدھے سادے اور براہ راست الفاظ ہوتے ہیں جن میں زندگی حرارت اور توانائی اور روزمرہ تجربات اور مشاہدات کا کرب ملتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ احساس بھی ہوتا جاتا ہے کہ ایک نظریے اور ایک مخصوص فکر کو انہوں نے اپنی ذات میں تحلیل کرلیا ہے۔ مسائل کے بارے میں ان کا تجزیہ اتنا مکمل ہے کہ وہ اصطلاحوں سے مرعوب کرنے یا 'کتابی علم' کے بل بوتے پر تقریر کرنے کے بجائے افہام و تفہیم کی فضا میں لکھتے اور بات چیت کرتے ہیں۔ اسی لیے ان کی نثر laboured یا پرآورد نہیں معلوم ہوتی۔ البتہ جہاں کہیں وہ مجلسی آداب کے ضرورت سے زیادہ پابند ہو کر سوچتے یا لکھتے ہیں وہاں ان کی تحریر میں ایک نمایاں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ یہاں الفاظ بھی زیادہ تر وہ نہیں ہوتے جو وہ بے تکلفانہ انداز میں استعمال کرتے ہیں اور نہ ہی تحریر میں وہ روانی اور قطعیت ہوتی ہے جو نظری مسائل پر لکھتے وقت نظر آتی ہے۔ ایسے مواقع ان کے ہاں بہت کم آتے ہیں لیکن جب کبھی ایسا موقع آتا ہے تو انداز کلام کچھ ایسا ہو جاتا ہے۔

> اورنٹیل کالج کے اساتذہ اور طلبائے قدیم کی جماعت میں اصحابِ علم و دانش کے بہت سے نام مرقوم ہیں۔ اس جماعت کی کسی تقریب میں شرکت بھی اعزاز سے کم نہیں۔ صدارت کا منصب تو روپے باید کے علاوہ اور بھی بہت سے کمالات چاہتا ہے۔ ارباب انجمن کی اس مرحمت اور جناب صدر استقبالیہ کے کرم گستر الفاظ کے لیے میں انتہائی احسان مند ہوں۔ تاہم اس مشفقانہ غلط بخشی کا بھید مجھ پر نہیں کھل سکا، مجھے اپنے کرم فرماؤں سے زنہار یہ گمان نہیں کہ مسند صدارت کے لیے ان کے انتخاب میں طنز ملیح کا کوئی پہلو نمایاں ہے۔'

مضمون خواہ کسی موضوع پر ہو فیض اس کا آغاز کسی غیر ضروری تمہید کے بغیر ایک ایسے جملے سے کرتے ہیں جس کے بعد نفس موضوع شروع ہی سے آپ کے خیال کا دامن تھام لیتا ہے۔ اور

آپ ہمہ تن توجہ بن کر اس مبحث میں شریک ہو جاتے ہیں۔ اکثر مضامین میں ان کا طرز اظہار امنطقیانہ ہے وہ چند اصول مرتب کر کے گفتگو شروع کر دیتے ہیں۔ دلیلوں اور سوالوں سے اپنی ہی قائم کردہ دلیلوں اور سوالوں کا جواب دیتے اور موضوع کے پرت کھولتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ وہ یک لخت پردہ کشائی کے قائل نہیں ہیں بلکہ چہرہ معانی سے آہستہ آہستہ نقاب اٹھانا انہیں زیادہ پسند ہے۔ وہ بقعۂ نور یا نگاہوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی کے بجائے مہتاب کی ہلکی ہلکی پھوار کے زیادہ دلدادہ ہیں۔ یہی ان کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو بھی ہے۔ وہ عام زندگی میں بہت کم سخن، شرمیلے اور دھیمے لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر گفتگو کرنے کے عادی ہیں۔ شاعری کی طرح ان کی نثر میں بھی ایک طرح کا دھیما پن پایا جاتا ہے۔ لیکن اس دھیمے پن سے استدلال کی کمزوری یا بیان کی نقاہت کے بجائے شرافت اور فنکارانہ انکسار مترشح ہوتا ہے۔

فیض کے ادبی فیصلوں سے، اصولوں کی بنیاد پر تو نہیں البتہ ذاتی پسند یا ناپسند کی بنا پر اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے فیض کی ذاتی رائے یہ ہو۔ 'حسرت موہانی کے بعد بہت کم شعرا ایسے ہونگے۔ جنہیں غزل کے مزاج سے ایسی صحیح مناسبت نصیب ہو جیسی خم کا کل (سیفؔ کا مجموعہ کلام) میں ملتی ہے، لیکن جہاں تک شعر کے مزاج اور شاعر کی ذہنی تعمیر کو سمجھنے کا تعلق ہے۔ اس منزل میں فیض نے خاصا ذمے دار رویہ اختیار کیا ہے اور ایسے موقعوں پر ان کی آرا بہت نپی تلی اور محتاط ہوتی ہیں۔ اور اس منزل پر پہنچ کر ان سے اختلاف کی گنجائش کم رہ جاتی ہے۔ مثلاً سیفؔ ہی کے بارے میں لکھتے ہوئے آگے چل کر اپنے موقف کی یوں وضاحت کر دی ہے۔' اس سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ حسرتؔ کے بعد سیفؔ ہمارا سب سے بڑا غزل گو شاعر ہے۔ یا سیفؔ سے بہتر غزل کہی نہیں گئی، لیکن میں یہ ضرور سمجھتا ہوں کہ آج کل کے دور میں غزلیات کا ایسا مجموعہ مشکل ہی سے ہاتھ آئے گا۔ جس میں غزل کے مخصوص محاسن کا ایسا مسلسل اور ہموار اظہار ہو جیسا کہ سیف کے کلام میں ہے۔' یا اسی طرح جوشؔ ملیح آبادی کو انقلابی شاعر کی حیثیت سے پرکھتے ہوئے پہلے انہوں نے انقلابی شاعر کا مفہوم متعین کیا ہے اور اسی مفہوم کی روشنی میں جوشؔ کی انقلابی شاعری کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ وہ جوشؔ کی عظمت اور اہمیت کے منکر نہیں ہیں۔ لیکن انقلابی ادب اور ترقی پسند ادب کو وہ نمایاں فرق کا حامل سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ 'صحیح انقلابی شاعری وہی ہے جو اشترا کی عقائد کے مطابق ہے۔' کیونکہ آج کل عام طور سے 'اصطلاحی معنوں میں انقلابی نظریے سے

اشتراکی نظریہ مراد لیا جاتا ہے۔' فیض کے خیال میں جوشؔ نے کامیاب ترقی پسند نظمیں لکھی ہیں لیکن ہر ترقی پسند تحریر کا انقلابی ہونا لازمی نہیں ہے۔ اسی لیے فیض نے جوش کے کلام کے نظریاتی پہلو پر غور کرتے ہوئے ان سے اختلاف کیا ہے۔ انہوں نے جوش کے کلام کی قدر و قیمت کو کم نہیں کیا ہے۔ وہ اس کے افادی اثرات کے قائل ہیں۔ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ جوش نے مروجہ نظام کے خلاف آواز اٹھائی ہے اور 'کسی نظام کے خلاف آواز اٹھانا ہمیشہ جرات اور دلیری چاہتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جوش کی مثال نے بہت سے نوجوان لکھنے والوں کا حوصلہ بڑھایا اور انہیں فکر و نظر کے نئے راستوں اور منازل کی جانب گامزن ہونے کی ترغیب دی۔ اسی طرح شررؔ، اردو ناول، پریم چند، نظیرؔ، اور حالیؔ اور رتن ناتھ سرشارؔ پر ان کے مضامین پڑھ کر فیض کے استدلال اور موقف سے اختلاف کے باوجود جو بہر حال ذاتی ہے، ان کے تجزیاتی اسلوب کی داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

فیض کی نثر اکثر و بیشتر شاداب، شگفتہ اور واضح اور برمحل ظرافت سے معمور ہوتی ہے۔ تحریر میں طنز و ظرافت کی یہ آمیزش سنجیدہ اور باوقار ہوتی ہے۔ جس کو پڑھ کر آپ کے ہونٹوں پر تبسم کی ایک ہلکی سی لکیر اُبھرتی ہے۔ چند جملے ملاحظہ ہوں:

> 'اگر آپ اپنی شکایتیں بڑھئی کے پاس لے جا کر جائیں تو کیا اس جواب سے آپ مطمئن ہو جائیں گے کہ صاحب آپ کے سب اعتراضات غیر کرسیانہ ہیں۔'

> 'موجودہ اردو شاعری کی ایک علامت تو یہ علامات کا لفظ ہی ہے۔ ذرا غور کیجئے اگر آپ آج سے پہلے کسی سے یہ پوچھتے کہ کیوں جی آپ کی شاعری کی علامات کیا ہیں تو آپ کو جواب ملتا۔ شاعری کی علامات؟ لاحول ولا قوۃ، شاعری نہ ہوئی طاعون ہوا۔'

> 'جمالیات کے شیدائی اس پر یہ اعتراض کریں گے کہ سماجی مفاد اور سماجی اہمیت ایک شاعر کے لیے مہمل اور بیکار باتیں ہیں، کسی نقاد کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ تلامیذ الرحمٰن کو اپنی غیر شاعرانہ روزمرہ زندگی کے مسائل میں الجھانے کی کوشش کرے۔'

'اہلِ نظر کو یہ الجھن اس لیے درپیش ہے کہ ان کا کاروبار اس شے سے بندھا ہے جسے اب سے پہلے کلچر یا تہذیب اور آج کل 'ثقافت' کہتے ہیں۔ سب سے پہلے آپ اسی بات پر غور فرمایئے کہ ہم نے ایسی لطیف شے کے لیے ایسا ''ثقیف'' لفظ کیوں چنا ہے۔ محض اس لیے کہ یہ لفظ کوفہ و بغداد کا باشندہ ہے اور اس لیے معتبر ہے۔'

'ہمارے فنی اور تہذیبی کاروبار کی کیفیت کچھ ایسی ہے جیسے بزرگوں کی آنکھ بچا کر سگریٹ پی جاتی ہے۔'

'سنان و خنجر، شمشیر و سناں، تیر اور کمند وغیرہ وغیرہ زیادہ دیکھنے میں نہیں آتے۔ عاشقی کی دنیا میں Disarmament (تخفیف اسلحہ) ہو چکی ہے۔'

ادبی تنقید کے ضمن میں فیضؔ نے قدما اور معاصرین میں سے بعض ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے نہ صرف ادب کی تنقید کے لیے ایک الگ اسلوب ایجاد کیا ہے بلکہ مصنف اور تصنیف دونوں کا جائزہ لیتے وقت کے سماجی، سیاسی اور اقتصادی پس منظر کو بھی پیش کیا ہے۔ اس صورت میں ادیب یا شاعر معاشرے یا زندگی سے الگ کوئی چیز معلوم ہونے کے بجائے زندگی کے سارے عوامل سے متاثر ہوتا اور ایک حساس اور ذمہ دار معاشرتی اکائی کی حیثیت سے جدوجہد حیات میں حصہ لیتا نظر آتا ہے۔ اس طرح مصنف کی تحریر میں محض روح عصر کا لفظ استعمال کر کے اپنی ذمے داری سے عہدہ برآ ہو جانے کے بجائے انہوں نے خود روح عصر کو پیش کر دیا ہے کہ آپ احساس کی شدت سے گزر کر اس سماجی اکائی کے ذہن تک پہنچیں جس نے کچھ محسوس کیا اور اس احساس کو آپ تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ جو باتیں نظری مسائل کے ضمن میں تخلیق اور تنقید سے متعلق انہوں نے سوچی ہیں، ان کی مزید وضاحت ان کے ادبی مضامین میں ملتی ہے۔

نثر نگار کی حیثیت سے فیض نے الفاظ کی ترتیب اور انتخاب میں بیشتر اوقات ذمے داری سے کام لیا ہے۔ اور خیال کو صحیح الفاظ میں پیش کرنے کے لیے کلچر یافتہ، اہمیت اور نا اہمیت، تجزیات کا تجزیہ، جذباتی وفاداری اور اسی قسم کی بہت سے تراکیب وضع کی ہیں۔ تاہم کہیں کہیں نظم کی طرح

نثر میں بھی وہ بعض ایسی غلطیوں کے مرتکب ہوجاتے ہیں جو فیضؔ یا کسی بھی قابل تقلید شاعر یا ادیب کے لیے مناسب نہیں۔

آخر میں ایک بہت اہم مسئلہ باقی رہ جاتا ہے۔ وہ ہے کلچر یا تہذیب کا مسئلہ۔ فیض انسانی تاریخ کے مادی اور جدلیاتی عمل سے باخبر ہیں۔ ان کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے برصغیر کے مخصوص حوالے کے ساتھ بین الاقوامی اور عالمی مسائل کا جائزہ لیا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے نہ صرف بعض بنیادی سوالات کے جواب دیے ہیں بلکہ خود بہت سے سوال اٹھا کر قاری اور اہل قلم کو سوچنے کی طرف مائل کیا ہے۔ ہر باشعور ادیب تخیل، تعقل، جذبہ، فکر، ذریعہ اظہار، الفاظ، وجدان، تجربہ، مشاہدہ زمان و مکاں، عدم وجود جیسے فلسفیانہ اور طبیعاتی و مابعدالطبیعاتی موضوعات کے بارے میں سوچتا ہے۔ لیکن اقتصادی قوتوں کو اہمیت دینے اور مذہب کے تصور سے الگ ایک قومی تہذیب کے امکانات پر غور وخوض کرنے والے ادیب کے لیے سب سے اہم مسئلہ اس علاقے کی تہذیب کا ہے جس کے اجتماعی شعور کا وہ ایک حصہ ہے اور جہاں ماضی کے رشتوں میں وہ حال کے لیے تانے بانے تلاش کرسکتا ہے۔ مغرب میں تو خیر کلچر یا تہذیب کی تمام بحثیں کسی نہ کسی عنوان جاری رہتی ہیں اور ان دنوں وہاں سائنسی کلچر اور ادبی کلچر جیسی اصطلاحوں پر بحث کی جارہی ہے۔ لیکن برصغیر کا مسئلہ ذرا مختلف ہے۔ تقسیم پاک و ہند سے قبل ہندو مفکر ہندو کلچر اور مسلم مفکر مسلم کلچر کا مفہوم متعین کرنے کی فکر میں منہمک تھے تاکہ دو قومی نظریے کا جواز پیدا ہوسکے۔ ان تحریروں کا خاصا اثر ہوا جو 'مسلم کلچر ان انڈیا' اور 'ہندو کلچر ان انڈیا' جیسے عنوانات کے تحت منظر عام پر آئی تھیں۔ لیکن ان میں غور و فکر کی ٹھوس بنیاد اور سائنسی انداز نظر مفقود تھا۔

قیام پاکستان کے بعد کلچر کے مسئلے پر زیادہ سنجیدگی سے غور وخوض کیا گیا ہے۔ اگرچہ ابھی تک اس سلسلے میں کوئی بات واضح نہیں ہوئی ہے اور چند سوالات ابھی تک تشنہ ہی معلوم ہوتے ہیں اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ پاکستان ایک ایسی نظریاتی مملکت ہے جس کا تاریخی رشتہ موہنجوداڑو، ہڑپہ، ٹیکسلا، کوٹ ڈیجی، بینامتی سے ملتا ہے اور سیاسی اعتبار سے اس مملکت کی عمر صرف سترہ سال ہے۔ اس مملکت میں مختلف علاقائی کلچر اور ان کے باشندوں کے جذباتی ردعمل موجود ہیں۔ یہ سب علاقائی قومیتیں اسلام کے نام پر متحد ہونے کی دعویدار ہیں۔ لیکن کلچر کا مسئلہ ذرا مختلف چیز ہے اور اس پر ذرا مختلف نوعیت سے غور وخوض کرنے کی ضرورت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مختلف

علاقائی زبانوں لباسوں اور علاقائی تہذیبوں کے دیگر مظاہر کے باہمی ارتباط و اختلاط سے ایک نیا کلچر پیدا ہو رہا ہے۔ جس کا نام ہم پاکستانی کلچر رکھ سکتے ہیں۔ لیکن کلچر صرف حال یا مستقبل کا نام نہیں ہے۔ اس کا ماضی سے بہت گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ کلچر کا حال درخت کا تنا اور مستقبل اس کے پتے اور ٹہنیاں ہوتی ہیں لیکن ماضی درخت کی وہ جڑیں ہیں جو مٹی میں دور تک پوشیدہ ہوتی ہیں۔ ان جڑوں سے درخت کو الگ کر کے درخت کا وجود قائم نہیں کیا جا سکتا۔ اور جس طرح کسی کیمیاوی یا طبعی عمل کے ذریعہ درخت کو نئی جڑوں کی مدد سے یا جڑوں کے بغیر زندہ رکھنا ممکن نہیں اسی طرح کلچر کے ماضی کو اپنانے کے لیے کسی شعوری کوشش سے کام نہیں لیا جا سکتا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کلچر کو عقلی بنیاد پر منتخب نہیں کیا جا سکتا۔ صدیوں پرانی روایات سے قوموں کا کچھ تاریخی اور جذباتی رشتہ ہوتا ہے اور یہ سارے رشتے ایک نامیاتی تسلسل میں آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ایک درخت میں کسی دوسرے درخت کی پیوندکاری سے پیوندی پتے اور پیوندی پھل پیدا کیے جا سکتے ہیں جو شکل وصورت، ذائقے اور دیگر خصوصیات میں بہت انوکھے اور منفرد ہونگے۔ لیکن یہ سب کچھ ایسی صورت میں ہو سکتا ہے جب اصل درخت کی جڑیں یعنی کلچر کا ماضی مصنوعی نہ ہو۔ ہمیں یہ سوچنا پڑیگا کہ سیاسی اعتبار سے سترہ سال پرانی اس مملکت کی پانچ ہزار سالہ تہذیب میں موہنجوداڑو، ہڑپہ، اور ٹیکسلا کے بعد سندھ میں محمد بن قاسم کی آمد اور مغل تہذیب میں کس طرح ایک ربط، تسلسل اور توازن پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ماضی کے ان مختلف النوع حقائق کو ایک نوع کی حقیقت کا مظہر کس طرح کہا جا سکتا ہے؟

ان میں سے بیشتر سوال خود فیضؔ کے ذہن میں بھی فطری طور پر پیدا ہوئے ہیں۔ فیضؔ نے تہذیب کے مباحث کو ان مضامین میں پیش کیا ہے جو تہذیب یا پاکستانی تہذیب پر لکھے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ فیض کے دیگر مضامین میں بھی جو ادب اور نظریے سے تعلق رکھتے ہیں تہذیب یا کلچر کے موضوع سے متعلق سوالات ابھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کلچر کے موضوع سے انہیں خصوصی دلچسپی ہے اور وہ کسی نہ کسی عنوان اس پر غور وفکر کرتے رہتے ہیں۔ تہذیب یا کلچر ان کے نزدیک 'اقدار (values) کا وہ نظام ہے جس کے مطابق کوئی سماج اپنی اجتماعی زندگی بسر کرتا ہے، تہذیب کے مسئلے کو فیض ایک سہ البعادی استعارے کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں، انہوں نے سب سے پہلے تہذیب کے طول وعرض اور گہرائی سے بحث کی ہے یعنی

تہذیب کی تاریخی عمر اس کے علاقائی یا جغرافیائی حدود اور مختلف قومی طبقوں اور عوام میں اس تہذیب کا نفوذ اور رسائی، پاکستان کی قومی تہذیب کے موضوع پر لکھتے وقت وہ سب سے پہلے یہ طے کرنا چاہتے ہیں کہ پاکستانی قوم کیا چیز ہے؟ اور اس کا جواب فیض کے پاس یہ ہے کہ 'یہ سوال تہذیبی نہیں سیاسی ہے۔' اس کے بعد تجزیے کی پہلی منزل یعنی ہماری تہذیب کے نقطہ آغاز کے سوال کا فیض نے اس انداز سے جائزہ لیا ہے:

پاکستان کی سیاسی تاریخ ابھی بسم اللہ کے مراحل میں ہے۔ لیکن اس خطے کے تہذیبی تاثر کی عمر پانچ ہزار سال سے اوپر ہے چنانچہ ایک صورت تو یہ ہے کہ ہم اپنی قومی اور تہذیبی تاریخ موہنجوداڑو اور ہڑپہ سے شروع کریں اگر یہ صورت ہمیں قبول ہے تو ہمیں وہ تہذیبی ورثہ بھی اپنانا ہوگا جو درمیانی ادوار میں ویدک، برہمنی، یونانی اور بدھ معاشروں نے پیدا کیا اس میں الجھن یہ ہے کہ ہمیں اپنے فنی اور تہذیبی تصور اور تخیل میں کافی ترمیم کرنی پڑے گی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ہم اپنی تاریخ، برصغیر ہند میں مسلمانوں کے دور سے شروع کریں۔ اس میں یہ الجھن ہے کہ ہمارے اجداد کسی واحد قوم وطن یا تہذیب کے نمائندہ نہ تھے۔ ان میں عرب بھی تھے ایرانی بھی تورانی بھی افغانی بھی۔ ہر ایک کی تہذیب الگ اور تاریخ جدا، مذہبی اور اخلاقی قدروں کے اشتراک اور طویل تاریخ اختلاط کے باعث ان تہذیبوں میں بہت سی باتیں مشابہ ضرور ہیں۔ لیکن کوئی ترک عرب، تہذیب یا قومیت کو اپنانے پر تیار نہیں، نہ کوئی عرب، ایرانی تہذیب و تاریخ کی وراثت قبول کرتا ہے پھر ان تہذیبوں کی ابتدا زمنہ قبل اسلام میں ہوئی ہے اور ان کے موجودہ نام لیوا اس قدیم وراثت سے نہ منکر ہیں نہ شرمسار۔'

اس تجزیے میں فکر کے ساتھ ساتھ فیض کا وہ مخصوص اسلوب نثر نگاری اپنی انتہائی نکھری ہوئی صورت میں نمایاں ہے۔ جس کے اساسی اجزا کی تعمیر شعور اور احساس کے باہمی امتزاج اور متوازن ہم آہنگی سے ہوتی ہے۔ اس بحث میں تہذیب کے فرض معنی جغرافیائی حدود کے مسئلے پر اس انداز سے غور و خوض کرنے کے بعد وہ جغرافیائی حدود کو بھی تہذیب کی بحث میں ایک مزاحم عنصر سمجھتے

ہیں۔البتہ اس بحث کی تیسری اور آخری شق یعنی تہذیب یا کلچر کی گہرائی کے سوال میں انہیں نے اس مسئلے کا حل اساسی دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ 'اس کا انحصار بیشتر سماجی یا معاشرتی نظام پر ہوتا ہے۔ یوں بھی ہوسکتا ہے کہ کسی معاشرے میں علم وفن، تہذیب وشائستگی زندگی کی دوسری نعمتوں کی طرح ایک بہت ہی محدود طبقے سے مخصوص ہوں اور یوں بھی ممکن ہے کہ قومی معاشرہ بہت غیر مساوی اور اس کے مختلف طبقوں میں بہت دوری نہ ہو۔'

فیض نے اس مسئلے کو بھی اصطلاحی زبان کا شکار ہوئے بغیر حل کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی تہذیب کا مسئلہ صرف اس کے عنصر ثالث ہی پر ارتکاز توجہ کے بعد حل ہوسکتا ہے۔اس کے بعد ماضی اور حال کے بہت سے رشتوں سے ہم خود کو ہم آہنگ کرسکیں گے اور وہ تہذیب عالم وجود میں آسکے گی جس سے نہ ہم منکر ہونگے اور نہ شرمسار۔

تہذیب جیسے مسئلے پر سوچتے وقت ایک ایسے مصنف اور مفکر کے جو نہ ماہر سماجیات ہے اور نہ ماہر بشریات ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اور لوگ اس مسئلے کو کس نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں اور سرے سے دیکھتے بھی ہیں یا نہیں؟ اس وقت ان لوگوں کے چہرے ذہن کے بردے پر اُبھرنے لگتے ہیں۔ 'جو تہذیب یا فن کا نام سنتے ہی یہ سوال کرتے ہیں کہ اس شے کے فوائد بیان کیجئے۔اس سے قومی خزانہ میں کتنا پیسہ آتا ہے، زرمبادلہ میں کیا بچت ہوتی ہے، گندم کی پیداوار میں کیا اضافہ ہوتا ہے۔'

مثالی کلچر کی تکوین کے لیے فیض کے ذہن میں کچھ باتیں بہت واضح ہیں اور انہوں نے نہایت وضاحت کے ساتھ انہیں بیان بھی کیا ہے۔ان کے خیال میں ہمیں مثالی کلچر کے قیام اور اس کی ترقی کے لیے ایک دوہرے عمل کی ضرورت ہے یعنی (۱) 'کلچر کی نوعیت بدلی جائے تاکہ عوام کی زندگی کا جزو بن سکے۔' (۲) 'عوام کی صلاحیتوں میں اضافہ کیا جائے تاکہ وہ اس کلچر کو قبول کرسکیں، اس کی مزید وضاحت یوں کی ہے '(۱) سماجی اقدار کی تربیت موزوں کی جائے اور صحیح اقدار کا پرچار کیا جائے (۲) ان اقدار کو عوام کے لیے اجتماعی طور پر سہل الحصول بنایا جائے۔'

فیض کی نثر کے مطالعے سے مجموعی تاثر یہی قائم ہوا ہے کہ شعروادب کے مسائل ہوں یا تہذیب اور انسانی افکار کے مباحث فیض ان موضوعات پر اس وقت قلم اٹھاتے ہیں جب ان کے ذہن میں موضوع کی نہ صرف جزئیات واضح ہو جائیں بلکہ وہ ان جزئیات کی ایک مجموعی تصویر بھی موثر اور مکمل الفاظ کے ذریعے آپ تک پہنچا سکیں۔اسی لیے فیض کی نثر میں ایک انفرادی

اسلوب نظر آتا ہے۔ لیکن اس اسلوب کو ہم اردو کے اسالیب نثر میں تاریخی یا تنقیدی اعتبار سے کیا درجہ دیں گے اس کا فیصلہ فی الحال مشکل ہے اس لیے کہ شبلی یا حالی کی طرح فیض کی نثر کا ابھی کوئی 'اعتبار' قائم نہیں ہوا ہے۔ تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ فیض کی نثر ہمارے اپنے دور کی نثر ہے۔ جس میں رومان یا انقلاب پر اظہار خیال کرتے ہوئے بقول فیض صرف اتنا ہی لکھ دینا کافی نہیں کہ 'ترا جسم ایک ہجوم ریشم و کمخواب ہے سلمیٰ' یا 'انقلاب زندہ باد'۔ عہد جدید میں لکھنے والا ایک ایسی حساس سماجی اکائی ہے، جو اگر عاشق ہے تو اسے صرف 'محبوبہ کے حسن اور اپنی بیقراری کا احساس نہیں ہوتا۔ بلکہ غم روزگار، گناہ کا خوف، جسم کی تشنگی، روح کی تنہائی، اپنی بے بضاعتی کا احساس اور ایسی ہی کئی ایک باتیں اس کے تجربے میں شامل ہوتی ہیں۔ سماج اور انقلاب پر غور کرتا ہے تو یہ بھی کچھ ایسی سیدھی بات معلوم نہیں ہوتی۔ اس کے اپنے طبقے کا مستقبل، مختلف سماجی قوتوں کے باہمی داؤ پیچ بین الاقوامی مہرہ بازی اور کئی ایسے الجھاؤ دکھائی دیتے ہیں۔'

دور جدید کے اس مسلسل کرب اور شدید کشمکش سے گزرنے اور اس سے آگاہ ہو جانے کے بعد آگہی کا جبر سہنے کے لیے منزل یا نروان سے بے نیاز ہو کر لمحۂ موجود کی منطق پر خلوص اور سچائی سے عمل پیرا ہونا پڑتا ہے۔ ذات کے تمام گوشوں میں جھانکنے اور نظام زندگی کے گرداں سیاروں کو دانش و فکر کی دوربینوں سے دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور پھر اس سارے مشاہدے کو احساس کی وسعت میں جذب کر کے الفاظ کے محسوس پیکر تراشنے پڑتے ہیں۔ یہ سارا عمل نظام زندگی کو دیکھنے کا عمل ہے۔ جس کے بارے میں خود فیض کا یہ کہنا ہے کہ۔

'نظام زندگی کسی حوض کا ٹھہرا ہوا سنگ بستہ، مقید پانی نہیں ہے جسے تماشائی کی ایک غلط انداز نگاہ احاطہ کر سکے۔ دور دراز، اوجھل دشوار گزار پہاڑیوں میں برفیں پگھلتی ہیں، چشمے ابلتے ہیں، ندی، نالے پتھروں کو چیر کر، چٹانوں کو کاٹ کر آپس میں ہمکنار ہوتے ہیں، اور پھر یہ پانی کتنا بڑھتا، وادیوں، جنگلوں اور میدانوں میں سمٹتا اور پھیلتا چلا جاتا ہے۔ جس دیدہ بینا نے انسانی تاریخ میں یمِ زندگی کے یہ نقوش و مراحل نہیں دیکھے، اس نے دجلہ کا کیا دیکھا ہے۔'

مشمولہ: 'افکار' فیض نمبر،

اپریل۔ مئی۔ جون، ۱۹۶۵ء

فیضؔ اور نشاطِ ہجر

فیض احمد فیضؔ کی شاعری اور شخصیت اپنے جغرافیائی حدود سے نکل کر دنیا کے گوشے گوشے میں اس طرح پہنچ گئی ہے کہ ۲۰۱۱ء میں، جو فیضؔ کے جشنِ صد سالہ سے عبارت ہے، دنیا کے ۱۰۹ شہروں میں فیضؔ کی تقریبات منعقد کی جارہی ہیں۔ یہ اعزاز مشکل ہی سے کسی شاعر کے حصے میں آیا ہوگا۔

فیضؔ کی شاعری کا بنیادی موضوع تو انسان دوستی اور درد کا رشتہ ہے لیکن ان کی شاعری اپنے اسلوب، رنگ و آہنگ اور طرزِ احساس کی بناپر اتنے رخ رکھتی ہے کہ ان کے کلام سے اظہار رائے کے نئے نئے پہلو نکلتے رہتے ہیں۔

فیضؔ کے بارے میں ان کی ابتدائی شاعری اور ان کے پہلے مجموعۂ کلام 'نقشِ فریادی' سے ہی طے ہوگیا تھا کہ ان کے کلام میں جاذبیت، دلکشی اور معنویت کے وہ عناصر موجود ہیں جو کسی شاعر کو تاریخِ ادب میں اور عام افراد کے ذہنوں اور دلوں میں محفوظ رکھتے ہیں۔

فیضؔ کی شخصیت کے بارے میں جو کچھ تفصیلات ملتی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ فیضؔ شروع ہی سے کم سخن اور شرمیلے واقع ہوئے تھے۔ ان کی شخصیت کا یہ رُخ تمام تر شہرت اور مقبولیت کے باوجود آخر تک قائم رہا۔

فیضؔ نے اپنی اعلیٰ تعلیم ختم کرنے کے بعد شاعری کا جو دور گذارا اس پر دوسری عالمی جنگ کے گہرے سائے منڈلا رہے تھے۔ خود فیضؔ نے اس عہد کے بارے میں اپنے اور دیگر نوجوانوں کے حوالے سے نثر میں یوں اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

'۲۹-۱۹۲۸ء سے ۳۵-۱۹۳۴ء تک ہماری طالب علمی کے دن تھے۔ یوں

تو ان سب اشعار کا قریب قریب ایک ہی ذہنی اور جذباتی واردات سے تعلق ہے اور اس واردات کا ظاہری محرک تو وہی ایک حادثہ ہے جو اس عمر میں اکثر نوجوان دلوں پر گزر جایا کرتا ہے۔ لیکن اب جو میں دیکھتا ہوں تو یہ دور بھی ایک دور نہیں تھا بلکہ اس کے بھی دو الگ حصے تھے جن کی داخلی اور خارجی کیفیت کافی مختلف تھی۔ وہ یوں کہ ۳۰۔۱۹۲۰ء کا زمانہ ہمارے ہاں معاشی اور سماجی طور سے کچھ عجیب طرح کی بے فکری، آسودگی اور ولولہ انگیزی کا زمانہ تھا، لیکن ہم لوگ اس دور کی ایک جھلک بھی ٹھیک سے نہ دیکھ پائے تھے کہ...... صحبتِ یار آخر شد۔ یہ وہ دن تھے جب یکا یک بچوں کی ہنسی بجھ گئی، اجڑے ہوئے انسان کھیت کھلیان چھوڑ کر شہروں میں مزدوری کرنے لگے اور اچھی خاصی شریف بہو بیٹیاں بازار میں آ بیٹھیں۔ گھر کے باہر یہ حال تھا اور گھر کے اندر مرگِ سوزِ محبت کا کہرام مچا تھا۔ یکا یک یوں محسوس ہونے لگا کہ دل و دماغ پر سبھی راستے بند ہو گئے اور اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔'

فیضؔ کے اس بیان سے اس وقت کے نوجوانوں کی معاشی بدحالی اور ذہنی پریشانی کے ساتھ ساتھ اس تنہائی اور بے یقینی کا بھی اندازہ ہوتا ہے جو فیضؔ کی اس زمانے کی نظم 'تنہائی' میں نظر آتی ہے۔

پھر کوئی آیا دلِ زار...... نہیں کوئی نہیں
راہ رو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

یہ اشعار اور بیانِ فیضؔ یہ نتیجہ اخذ کرنے کے لیے کافی ہیں کہ ایسے شخص کو احساسِ تنہائی اور محبت میں ناکامی کا جو تجربہ ہوا ہے وہ اس کی پوری شخصیت کو اپنی گرفت میں لے چکا ہے۔ ایک باشعور تخلیقی ذہن کا امتحان یہیں ہوتا ہے۔ میرؔ نے تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا اور غالبؔ نے...... 'ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا' کہہ کر اس کے تحت عملی اور تخلیقی زندگی بسر کر کے ثابت کر دیا کہ

باشعور اور حساس تخلیقی ذہن مسائل و مصائب سے مغلوب نہیں ہوتا بلکہ ان پر غالب آ کر اپنے اردگرد پھیلے ہوئے دشت کو گلزار میں بھی تبدیل کر سکتا ہے۔

فیض کے کلام میں ہجر اور تنہائی کا ابتدا ہی سے اظہار ہوا ہے اور جیسے جیسے وقت گزرتا گیا حالات اور واقعات نے بھی اس صورتِ حال کو سنگین سے سنگین تر بنایا۔ جذباتی واردات اور یادوں کے حوالے سے 'نقشِ فریادی' کے شروع ہی میں یہ اشعار نظر آتے ہیں ۔

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے

یہیں سے اندازہ ہوتا ہے کہ فیض نے تخلیقی سطح پر اپنی شخصیت میں ایک ایسا میکنزم پیدا کر لیا ہے جو تصور اور خیال کی دنیا سے نشاط اور دل دہی کی مہک اپنے ذہن و دل میں بسا کر شاعری کا حصہ بنانے پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ ابتدائی ہجر و وصال کی کیفیات تو وہی ہیں جو بقول فیض عمر کے ایک حصے میں ہر نوجوان کے لیے اہمیت رکھتی ہیں۔ اس کو بھی فیض نے 'ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے' سے تعبیر کیا ہے اور محسوسات کی سطح پر ایک زندہ حقیقت کے طور پر اپنا لیا ہے۔ اس ضمن میں حالات و واقعات کا جو اشارہ میں نے کیا ہے اس سے فیض شناس بخوبی واقف ہیں۔ صرف تھوڑے سے اعادے کی ضرورت ہے۔

۱۹۵۰ء کی دہائی میں نام نہاد راولپنڈی سازش کیس کے تحت فیض کو قید و بند کی صعوبتوں سے گزرنا پڑا۔ تنہائی اور ہجر کا یہ ایک اور تجربہ تھا۔ اب جیسا کہ فیض نے لکھا ہے کہ چار برس کے قید و بند کے دور میں دو کتابیں 'دستِ صبا' اور 'زنداں نامہ' جیل جانے کی یادگار ہیں۔ فیض نے اس ضمن میں بہت واضح طور پر اپنے ذہنی محسوسات اور معمولات کا یوں تذکرہ کیا ہے:

> 'جیل خانہ عاشقی کی طرح خود ایک بنیادی تجربہ ہے جس میں فکر و نظر کا ایک آدھ نیا دریچہ خود بخود کھل جاتا ہے۔ اوّل تو یہ کہ ابتدائے شباب کی طرح تمام حسیات یعنی سینسیشنز (sensations) پھر تیز ہو جاتی ہیں اور صبح کی پو، شمع کے دھندلکے، آسمان کی نیلاہٹ، ہوا کے گداز کے بارے

میں وہی پہلا سا تجربہ لوٹ آتا ہے۔ دوسرے یوں ہوتا ہے کہ باہر کی دنیا کے وقت اور فاصلے دونوں ہی باطل ہو جاتے ہیں۔ نزدیک کی چیزیں بھی بہت دور ہو جاتی ہیں اور دور کی نزدیک۔ فردا اور دی کا تفرقہ کچھ اس طور سے مٹ جاتا ہے کہ کبھی ایک لمحہ قیامت معلوم ہوتا ہے اور کبھی ایک صدی کل کی بات۔ تیسری بات یہ ہے کہ فراغتِ ہجراں میں فکر و مطالعہ کے ساتھ عروسِ سخن کے ظاہری بناؤ سنگھار پر توجہ دینے کی زیادہ مہلت ملتی ہے۔'

ہمارے ادب میں حیاتی تحریروں کی کمی نہیں مگر جس طرح فیضؔ نے جیل کی زندگی کو ان تین باتوں میں اجاگر کیا ہے وہ کہیں اور نظر نہیں آتیں۔

فیضؔ نے دوری اور یاد کے سلسلوں کو زنداں اور قفس میں بھی ایک نشاطیہ تجربے میں بدلا ہے۔ ان کا یہ قطعہ اسی رخ کی نمائندگی کرتا ہے۔

یہ خوں کی مہک ہے کہ لبِ یار کی خوشبو
کس راہ کی جانب سے صبا آتی ہے دیکھو
گلشن میں بہار آئی کہ زنداں ہوا آباد
کس سمت سے نغموں کی صدا آتی ہے دیکھو

جگر مرادآبادی نے، جو موضوعات کے تضاد اور پیراڈاکس کا خاص اہتمام اپنی شاعری میں رکھتے تھے، یہ کہا تھا۔

ہجر میں شاد، وصل میں ناشاد
کیا طبیعت جگر نے پائی ہے

یہ تو جگر کی بات تھی لیکن فیضؔ کے لیے وصل میں ناشاد کہنا مشکل ہے۔ ہاں! انہوں نے ہجر میں شاد رہ کر اپنی شاعری کو جو رخ دیا ہے وہ ہر لحاظ سے حوصلہ مندی کا ایک جمالیاتی اشارہ ہے۔ مثالیں فیضؔ کے کلام سے مسلسل پیش کی جاسکتی ہیں۔ چند ایک حسبِ ذیل ہیں۔

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں

ہوئی ہے حضرتِ ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سرِ کوئے یار گزری ہے
یادِ غزال چشماں، ذکرِ سمن عذاراں
جب چاہا کر لیا ہے کنجِ قفس بہاراں
تم آ رہے ہو کہ بجتی ہیں میری زنجیریں
نہ جانے کیا مرے دیوار و بام کہتے ہیں
پھر نظر میں پھول مہکے، دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصور نے لیا اس بزم میں جانے کا نام

وطن سے دور فیض کے لیے ہجر کی ایک اور جہت ہے۔ زنداں میں وطن کے لیے وہ اس طرح محسوس کرتے ہیں۔

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہوگی
غرض تصور شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفت سایۂ دیوار و در میں جیتے ہیں

فیض نے مشرق و مغرب کے بہترین ادب کا مطالعہ کیا تھا۔ اسیری کے زمانے میں بھی ان کا یہ عمل جاری رہا۔ ایلس کے نام اپنے اکثر خطوں میں وہ یا تو حاصلِ مطالعہ کی بات کرتے ہیں یا بعض کتابوں کی فرمائش تحریر کرتے ہیں۔ انہوں نے شعر و ادب کے اہم سرچشموں سے فیضان حاصل کیا لیکن وہ جن دو عظیم شاعروں سے سب سے زیادہ متاثر تھے وہ حافظ شیرازی اور مرزا غالب ہیں۔ وہ ان دونوں کو اپنا معنوی استاد مانتے تھے اور کہتے تھے کہ ان کا کلام تو ہمہ وقت ہمارے پاس رہتا ہے اور ان کے کسی مضمون یا ترکیب کو اگر ہم مستعار لیتے ہیں تو اس کا سبب یہ ہے کہ ایک تو یہ دونوں شاعر ہمارے تخلیقی وجود پر سایہ فگن رہے ہیں، دوسرے ان کا کوئی مضمون اور ترکیب ڈھکی چھپی نہیں ہے، سب کو معلوم ہو جاتا ہے کہ ہم نے کس طرح استفادہ کیا ہے۔

حافظؔ اور غالبؔ کی شاعری کے مختلف اسالیب، موضوعات اور تخلیقی قوت کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ یہاں نشاط کے تناظر میں فیضؔ کی اثر پذیری کا زاویہ پیشِ نظر رہے۔ لہٰذا اسی نسبت سے کچھ عرض کیا جائے گا۔

حافظؔ کے یہاں غمِ ذات، غمِ زمانہ اور غمِ کائنات کا ایک ہی حل ہے کہ۔

خاک بر سر کن غمِ ایام را

حافظؔ کی رجائیت غم واندوہ اور نامساعد حالات میں بھی امید اور نشاط کا ماحول پیدا کر لیتی ہے۔

یوسف گم گشتہ باز آید بکنعاں غم مخور

....

جز رسید کہ ایامِ غم نہ خواہد ماند
چناں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند

غالبؔ کی رجائیت اور حوصلہ مندی بھی ان کے ان اشعار میں نمایاں ہے۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا
موجِ خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا

جیل کے شب و روز کو فیضؔ نے اس طرح بسر کیا کہ خود ان کے لیے وہاں کی زندگی کیفیات و حسیات ایک نیا تجربہ بن کر رہ گیا۔ منجملہ دوسری باتوں کے جیل سے ایلس فیض کے نام لکھنا فیضؔ کے لیے کئی اعتبار سے اہم تھا۔ ایک تو سب سے قریب رفیقِ حیات سے اس طرح محوِ کلام ہونا، دوسرے اپنی دلی کیفیات کو بے کم و کاست بیان کر دینا، تیسرے کیتھارسس کا اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ فیضؔ کے پاس نہ تھا لیکن کبھی کبھی وہ ایلس کو بھی خط نہ لکھنے کے بارے میں اپنا باطن عیاں کر دیتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔ 'شاید تمہیں عجیب لگے لیکن یہاں خط نہ لکھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ جب یہاں ان چیزوں کی یاد جو دل کو عزیز ہیں زیادہ ستانے لگے تو یہ یادیں اتنی شفیق، خوب صورت اور گرمانے والی محسوس ہوتی ہیں کہ ان کے مدوجزر میں رکاوٹ ڈالنے کو جی نہیں چاہتا۔'

شاید ہی کسی زندانی نے اس انداز سے اپنے جذبات اور محسوسات کا تجزیہ کیا ہو جیسا کہ فیضؔ نے ان سطور میں کر دیا ہے کیونکہ یہ بہت نازک اور نا قابلِ بیان کیفیات ہیں۔ یہ جذباتی ماحول جو فیضؔ کے جسم و جاں میں موجود تھا، جیل کے دنوں میں ان کی رجائیت اور نشاطِ ہجر کا سب سے بڑا محرک رہا۔ اپنے محبوب وطن اور نظریے کو فیضؔ نے لہو کی ایک ہی گردش میں سمو دیا تھا اسی لیے انہیں ہجر میں وصل اور قربت کا ہی احساس رہتا تھا۔

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں کب ہات میں تیرا ہات نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں
یہ بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا ہارے بھی تو بازی مات نہیں

....

پھر نظر میں پھول مہکے دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصور نے لیا اس بزم میں جانے کا نام

اور فیضؔ کی یہ نظم 'یاد' جو نشاطِ ہجر کی کیفیت کو نئے اسالیب اور نئی علامات میں ڈھالنے کے بعد کی ایک غیر معمولی تخلیقی مثال بن گئی۔

دشتِ تنہائی میں اے جانِ جہاں، لرزاں ہیں
تیری آواز کے سائے، ترے ہونٹوں کے سراب
دشتِ تنہائی میں، دوری کے خس و خاک تلے
کھِل رہے ہیں، ترے پہلو کے سمن اور گلاب
اٹھ رہی ہے کہیں قربت سے تری سانس کی آنچ
اپنی خوشبو میں سلگتی ہوئی مدھم مدھم
دور...... اُفق پار، چمکتی ہوئی قطرہ قطرہ
گر رہی ہے تری دلدار نظر کی شبنم
اس قدر پیار سے، اے جانِ جہاں، رکھا ہے
دل کے رخسار پہ اس وقت تری یاد نے ہاتھ

یوں گماں ہوتا ہے، گرچہ ہے ابھی صبح فراق
ڈھل گیا ہجر کا دن، آ بھی گئی وصل کی رات

ہجر کا ایک روایتی اور شاعرانہ مفہوم ہے۔جس کی رو سے مہجر جیتے جاگتے ایک زندہ پیکر کی جدائی کا غم یا اس کو یاد کرنے کے لمحات سے عبارت ہوتا ہے اور ایک ہجر وہ ہے کہ جو ترکِ وطن کرنے والوں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اسی لیے عربی شاعری میں ان شاعروں کو جو ترکِ وطن کر کے دوسرے ممالک میں آباد ہوئے، شعرائے مہجر کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے ایک طرف تو وطن سے دوری کی کلفت اور پھر وطن بھی وہ جس کے لیے پہلے ہی فیض نے کہہ دیا تھا ۔

چاہا ہے اسی رنگ میں لیلائے وطن کو

اب اسی ہجر میں ہی اپنے ذہن کو شاداب رکھنا اور اپنے محسوسات کی دنیا میں نشاطیہ رنگ پیدا کر لینا فیض کی شاعری کا خاص وصف ہے ایک نظم میں یہ کیفیت اس طرح نمایاں ہوئی ہے ۔

وہ در کھلا میرے غم کدے کا
وہ آ گئے میرے ملنے والے
وہ آ گئی شام اپنی راہوں میں
فرش افسردگی بچھانے

....

یہ آئے سب میرے ملنے والے
کہ جن سے دن رات واسطہ ہے
کہ کون کب آیا کب گیا ہے
نگاہ و دل کی خبر کہاں ہے
خیال سوئے وطن رواں ہے
سمندروں کی ایال تھامے
ہزار وہم و گماں سنبھالے
کئی طرح کے سوال تھامے

پھر تاریخ کے بعض اہم کرداروں اور واقعات سے بھی اپنے لیے تسلی اور نشاط کا کوئی رخ پیدا

کر لیتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

فیض نہ ہم یوسف نہ کوئی یعقوب جو ہم کو یاد کرے
اپنی کیا کنعاں میں رہے، یا مصر میں جا آباد ہوئے

اس شعر میں غنی کاشمیری کے ایک شعر کی طرف کنایہ ہے جسے فیض نے غزل کے آخر میں درج بھی کر دیا ہے۔

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

وطن سے دوری کے شب و روز جس طرح گذرتے ہیں ان کی کوئی اپنی منطق یا طے شدہ رخ نہیں ہوتا۔ یہ اس ابتلا سے گذرنے والی شخصیت پر منحصر ہے کہ وہ اپنی تالیف قلب کے لیے کیا پیرایۂ خیال اور زاویۂ اظہار وضع کرتا ہے۔ فیض کے ان اشعار میں یہ رخ اس طرح ظاہر ہوا۔

شامِ فراق اب نہ پوچھ، آئی اور آ کے ٹل گئی
دل تھا کہ پھر بہل گیا، جاں تھی کہ پھر سنبھل گئی
بزمِ خیال میں ترے حسن کی شمع جل گئی
درد کا چاند بجھ گیا ہجر کی رات ڈھل گئی
جب تجھے یاد کرلیا، صبح مہک مہک اٹھی
جب تیرا غم جگا لیا، رات مچل مچل گئی

اس انداز کا شاعرانہ اظہار کسی اور شاعر کے ہاں نظر نہیں آتا۔ فیض نے اس اعتبار سے ہجر کے مفہوم کو ہی تبدیل کر دیا۔ بالکل اسی طرح جیسے انہوں نے رقیب کے معنی ہماری روایتی شاعری سے بالکل مختلف انداز میں پیش کیے۔ فیض نے 'مرے دل مرے مسافر' میں وطن سے دوری کو اور بار بار وطن سے مجبوری کو بار بار مرنے یا قتل ہونے سے تعبیر کیا ہے اور غالب کے اس شعر سے اس کیفیت کو دو چند کر لیا ہے۔

ہمیں کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

اس میں شک نہیں کہ وطن سے دور رہ کر جلاوطنی کے ماحول میں وہ تمام رشتے یاد آتے ہیں جنہیں جذباتی اور ذاتی زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ فیض نے اس مرحلے پر

بھی نشاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور رجائیت و مستقبل کی بہتر ساعتوں کو اپنے تخلیقی عمل کا حصہ بناتے ہوئے جب وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ ہجر اور یہ دوری محبوب کے علاوہ وطن کے حوالے سے بھی ان کی شاعری کا حصہ ہے جسے 'چاہا ہے اسی رنگ میں لیلائے وطنِ کو'، تو ان کا مسلک یہ بن جاتا ہے۔

ہر کہ از دوست می رسد نیکوست

چنانچہ کہتے ہیں۔

کبھی کچھ ہے تیرا دیا ہوا، کبھی راحتیں، کبھی کلفتیں
کبھی صحبتیں، کبھی فرقتیں، کبھی دوریاں، کبھی قربتیں
یہ سخن جو ہم نے رقم کیے، یہ ہیں سب ورق تری یاد کے
کوئی لمحہ صبحِ وصال کا، کئی شام ہجر کی مدتیں

فیض کی شاعری کا یہ رُخ ہر لحاظ سے قابلِ ستائش بھی ہے اور قابلِ قدر بھی۔ فیض کی شاعری کے اس زاویے سے وہ شعاعیں اور وہ خوشبو حصارِ ذہن تک آتی ہیں جن سے کوئی بھی ایسا فرد اور معاشرہ جسے ہجر اور دوری کے ایسے تجربوں سے گزرنا پڑے روشنی اور حلاوت حاصل کرسکتا ہے۔ فیض کی شاعری کا یہ ایسا فیض ہے جو نسل در نسل اور عہد بہ عہد جاری رہے گا۔

فیض اور فلسطین

فیض احمد فیض جدید اردو شاعری کی اس منتخب اور کمیاب صف سے تعلق رکھتے ہیں جن کی شاعری نظریات، سیاست اور انسانی مسائل کی بھرپور ترجمانی کے باوجود بنیادی طور پر شاعری ہی رہتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ فیض کو مزدور، کسان، طلبا اور نظریاتی حلقوں میں جتنی مقبولیت حاصل تھی اتنی ہی بیوروکریسی، صنعتی دنیا اور سیف و تفنگ سے تعلق رکھنے والے حلقوں میں بھی تھی۔ کسی حلقۂ سامعین میں انہیں اپنا کلام تامل کے ساتھ پڑھنا پڑتا تھا اور نہ کسی مصلحت کے تحت ترمیم و تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ گویا کسی بھی حلقے میں اپنا کلام پیش کرتے ہوئے انہیں اتنی ہی سہولت ہوتی تھی جتنی کسی غیر نظریاتی یا خالص شاعر (پیور پوئٹ) کو ہو سکتی ہے۔ یہ وصف دراصل فیض کے اس شاعرانہ ہنر میں پوشیدہ تھا کہ انہوں نے کلاسیکی فضا، اپنے تہذیبی اور ثقافتی رموز کو جدید دنیا کے مسائل کی ترجمانی سے اس طرح ہم آہنگ کر دیا تھا کہ ظاہری پیرہن بہت جدید نہ ہوتے ہوئے بھی اس کی ساخت اور بافت میں ایک ناگزیر جدت اور ندرت جگہ پا گئی تھی۔

فیض نے کس طرح ذاتی غموں سے گریز کر کے ایک اجتماعیت کو سارے محسوسات کا پیمانہ بنا لیا، اس کا بیان خود فیض کی کئی تحریروں میں ملتا ہے۔ جس قسم کی زندگی اور اس کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی رشتے فیض اور ان کی نسل کے حصے میں آئے تھے انہوں نے شاعری میں اپنے اظہار کے لیے ایک راستہ ڈھونڈ لیا تھا۔

اقبال نے 'بچے کی دعا' کا ایک شعر یوں ادا کیا ہے۔

ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
دردمندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا

فیضؔ نے جب 'رقیب' کے روایتی مفہوم کو تبدیل کر کے پہلی بار اسے ایک علامتی حیثیت دی اور 'رقیب سے' خطاب کیا تو ان کے ہاں ایک مصرعہ یوں سامنے آیا۔

عاجزی سیکھی غریبوں کی حمایت سیکھی

اس کے بعد کے مصرعے یہ ہیں۔

یاس و حرمان کے دکھ درد کے معنی سیکھے
زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے رُخِ زرد کے معنی سیکھے

فیضؔ کا یہ مزاج روایتی رومانیت سے ہٹ جانے کے بعد بنا۔ اگرچہ ان کی شاعری میں اوّل تا آخر ایک نوع کی رومانی فضا اور عشقیہ کسک برابر قائم رہی لیکن جس آدرش کو انہوں نے اپنی ذات اور ضمیر کا حصہ بنایا، وہ اپنے اندازِ قد سے صاف پہچانا جاتا ہے۔ فیضؔ کا یہ مزاج اور یہ آدرش الگ سے اوڑھا ہوا یا طاری کردہ نہیں تھا۔ انہوں نے گردوپیش کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو ذہن اور محسوسات کی سطح پر یکساں برتنے اور اسے ایک منتخب ہیئت دینے کی کوشش کی ہے۔

برصغیر میں غیر ملکی راج، آزادی کی جدوجہد، لیلائے وطن کا وصل و ہجر اور ہم وطنوں کی دلداری اور دل آسائی تو فیضؔ کی شاعری کا بنیادی رخ ہے ہی لیکن اس سے ہٹ کر بھی انہوں نے اپنے عہد کے بعض انتہائی اہم اور سنگین واقعات پر بھی جن کا تعلق عالمی اقوام سے تھا، بے مثال نظمیں لکھی ہیں۔ 'ایرانی طلبا کے نام' روزنبرگ کی سزائے موت (ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے) سے لے کر عرب اسرائیل جنگ اور فلسطینیوں کی جدوجہدِ آزادی تک فیضؔ کی سیاسی اور نظریاتی شاعری پوری طرح شعورِ عصر کا ساتھ دیتی اور آگے ہی آگے سفر کرتی نظر آتی ہے۔

فیضؔ کو اقوامِ عالم میں ظالم و مظلوم کی آویزشوں کی پوری خبر تھی۔ وہ ذاتی طور پر بیشتر ممالک کا سفر کر چکے تھے۔ جہاں نہیں گئے تھے وہاں کے قابلِ ذکر اہلِ قلم سے وہ عالمی اجتماعات میں مل لیتے تھے۔ پھر اپنے عہد سے حقائق کی سطح پر واقف ہونے کا ایک اور ذریعہ ان کا مطالعہ تھا۔ ساتھ ہی زیادہ سے زیادہ واقعات کو ان کے صحیح اور معروضی تناظر میں دیکھنے کا ملکہ بھی انہیں حاصل تھا۔

فیضؔ کے سیاسی شعور کی ایک جھلک اس تقریر میں بھی ملتی ہے جو انہوں نے 'لینن امن انعام' کی تقریب میں کی تھی۔ وہ کہتے ہیں:

'سامراجی اور غیر سامراجی قوتوں کی لازمی کشمکش کے علاوہ بدقسمتی سے بعض ایسے ممالک میں بھی اختلافات موجود ہیں، جنہیں حال ہی میں آزادی ملی ہے۔ ایسے اختلافات ہمارے ملک پاکستان اور ہمارے سب سے قریبی ہمسائے ہندوستان میں موجود ہیں۔ بعض عرب ہمسایہ ممالک میں اور بعض افریقی حکومتوں میں موجود ہیں۔'

اس کے بعد فیضؔ نے امن کی ضرورت پر زور دیا ہے، لیکن امن جب محض ایک خواب رہ جائے اور خواب دیکھنے والی آنکھوں میں میزائیلوں کا زہر اور آتش زدہ انسانی بستیوں کا دھواں نشتر زنی کرنے لگے تو 'پڑھی جاتی ہے اور ادھر کو بھی نظر کیا کیجیے۔'

عرب اسرائیل کشمکش ہمارے عہد کی ایک سنگین صورتِ حال ہے جس کو ہمارے ہاں مختلف زاویوں سے دیکھا، سمجھا اور پیش کیا جاتا ہے۔ فیضؔ کو عرب کاز سے لگاؤ تھا۔ وہ عربی زبان و ادب سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ عربی میں ایم اے کرنے کے علاوہ عربی ادبیات سے ان کا شغف آخر تک قائم رہا۔ جب وہ پہلی بار قید و بند کی صعوبتوں سے گزر رہے تھے تو انہوں نے ایلس فیض سے جن کتابوں کی جیل سے فرمائش کی تھی ان میں نکلسن کی 'تاریخ عربی ادب' بھی شامل تھی۔ فیضؔ کے کلام کے ترجمے دیگر زبانوں کے علاوہ عربی میں بھی ہوئے۔ مصر، عراق، شام اور لبنان کے لیے وہ اجنبی نہیں تھے۔ لیکن ان کی اصل وابستگی کا بھرپور اظہار 'سرِ وادیٔ سینا' سے ہوا جو ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد لکھی گئی۔

جون ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں اسرائیل کو فتح ہوئی اور عربوں کے لیے یہ صورتِ حال اس قدر غیر متوقع اور تباہ کن ثابت ہوئی کہ مادی نقصانات کے ساتھ ساتھ اخلاقی سطح پر بھی بڑی بے دلی اور بے کسی کا تجربہ ان کا مقسوم ہو گیا۔

جدید عربی شعرا میں نزار قبانی کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ انہوں نے 'کتاب پسپائی کے حاشیے' کے عنوان سے جون ۱۹۶۷ء کے المیے پر ایک بہت مؤثر اور باغیانہ نظم لکھی جو اگست ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی۔ اس نظم کے شائع ہوتے ہی ساری عرب دنیا میں تہلکہ مچ گیا اور کئی ممالک میں اس نظم

کی درآمد اور اشاعت ممنوع قرار دی گئی۔ لیکن چونکہ واقعہ سنگین تھا اور عرب شعرا اس کو ایک ہی طرح محسوس کر رہے تھے اس لیے نہ صرف نزار قبانی کی اس نظم کو وسیع پیمانے پر پھیلایا گیا بلکہ دوسرے شعرا اور ادبا نے بھی جون کے اس المیے پر لگاتار نظم و نثر میں اپنے محسوسات کا اظہار کیا۔ عربی میں چونکہ ماہِ جون کو 'حزیران' کہتے ہیں اس لیے اس ذیل میں لکھا جانے والا سارا ادب 'الادب الحزیرانی' (جون کا ادب) کہلاتا ہے۔ فیضؔ کی نظم 'سرِ وادیٔ سینا' بھی ۱۹۶۷ء میں لکھی گئی تھی اور اسے بھی حزیرانی ادب میں شامل کرنا چاہیے۔ فیضؔ اس المیے سے اس حد تک متاثر ہوئے کہ اپنے شعری مجموعے کا نام بھی 'سرِ وادیٔ سینا' رکھا اور اس کے سرِ ورق میں جوان کی بیٹی نے بنایا تھا اس المیے کا عکس جھلکتا ہے۔

فیضؔ کی نظم کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

پھر برق فروزاں ہے سرِ وادیٔ سینا
پھر رنگ پہ ہے شعلۂ رخسارِ حقیقت
پیغامِ اجل دعوتِ دیدارِ حقیقت
اے دیدۂ بینا

اگر چہ یہ انتہائی مایوسی اور پسپائی کا دور تھا لیکن فیضؔ کی رجائیت نے اسے ارضی اور تاریخی سطح پر فردا کی ایک کامیاب و کامران ساعت کے نزول کا پیش خیمہ قرار دیا۔ چونکہ صدیوں سے مفتیِ دیں کا شعار تائیدِ ستم رہا ہے اس لیے فیضؔ قانونِ فطرت کی سمت اشارہ کرتے ہوئے لوحِ دل پر ایک نئے فرمان کے رقم ہونے کا مژدہ سناتے ہیں۔

پھر دل کو مصفا کرو، اس لوح پہ شاید
مابینِ من و تو، نیا پیماں کوئی اُترے
اب رسمِ ستم حکمتِ خاصانِ زمیں ہے
تائیدِ ستم مصلحتِ مفتیِ دیں ہے
اب صدیوں کے اقرارِ اطاعت کو بدلنے
لازم ہے کہ انکار کا فرماں کوئی اُترے

اس کے بعد عرب کاز سے رفتہ رفتہ فیضؔ کی عملی دلچسپی بڑھتی گئی۔ وہ 'لوٹس' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے

تھے۔ اس کا دفتر بیروت منتقل ہوگیا۔ فلسطینی تحریکِ مزاحمت کے سربراہ یاسر عرفات سے فیض کے ذاتی مراسم تھے۔ انہوں نے فیض کی وفات پر ایک ذاتی خط میں انہیں ہدیہ تبریک اور خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

فیض کا مجموعۂ کلام 'مرے دل مرے مسافر' ایک طرح سے قیامِ بیروت کی یادگار ہے۔ اس مجموعے کو انہوں نے یاسر عرفات کے نام معنون کیا ہے۔ اس میں کئی نظمیں بیروت اور اہلِ فلسطین کو مخاطب کرکے لکھی گئی ہیں۔ اسی طرح فیض کی کلیات 'نسخہ ہائے وفا' کا آخری حصہ جو 'غبارِ ایام' کے نام سے موسوم ہے، بیروت کی یادگار نظموں کا حامل ہے۔ فیض نے زندگی کے آخری دور میں بیروت ہی سے تعلق رکھا۔ وہاں ۱۹۸۲ء کی بمباری میں وہ اور ایلس فیض لوٹس کے دفتر کے ایک حصے میں مقیم تھیں۔ بیروت کی تباہی اور فلسطینیوں کے انخلاء پر ان کی نظم 'عشق اپنے مجرموں کو پا بجولاں لے چلا' گہرا حزنیہ تاثر چھوڑتی ہے:

لوٹ کر آ کے دیکھا تو پھولوں کا رنگ
جو کبھی سرخ تھا، زرد ہی زرد ہے
اپنا پہلو ٹٹولا تو ایسا لگا
دل جہاں تھا وہاں درد ہی درد ہے
گلو میں کبھی طوق کا واہمہ
کبھی پاؤں میں رقصِ زنجیر
اور پھر ایک دن عشق انہیں کی طرح
'رسن در گلو، پا بجولاں' ہمیں
اسی قافلے میں کشاں لے چلا

فیض اس دور کی شاعری میں اس فضا سے بہت قریب رہے جو عرب شعراء کی مزاحمتی شاعری کا خاصہ ہے۔ فیض جدید عرب شعراء سے یوں بھی مزاجاً قریب ہیں۔ جس طرح فیض نے کلاسیکی اسالیب کو اردو، فارسی اور عربی سے اخذ کیا اور جدید مغربی اسالیب سے ہم آہنگ کرکے ایک اپنا انفرادی اسلوب وضع کیا ہے اسی طرح پانچویں اور چھٹی دہائی کے جدید شعرائے عرب نے مغربی ممالک کے نظریاتی شاعروں کی تقلید اور ترجموں کے ذریعے ایک نیا مزاج شاعری تخلیق کیا تھا۔

ان میں بدر الشاکر السیاب، عبدالوہاب البیانی اور نازک الملائکہ کے نام بطور خاص اہم ہیں۔ ان شعراء کے زیرِ اثر جدید معاصر عربی شاعری کا یہ مزاج بن گیا کہ نظم خواہ محبت کے بارے میں ہو خواہ گذشتہ یادوں۔ حتیٰ کہ خود رحمی جیسے انتہائی داخلی جذبے پر مبنی ہو، بنیادی طور پر اس کے آہنگ اور علامات میں سیاسی حالات کا پرتو، وطن کی یاد اور بے وطنی کا غم یا اپنی جدوجہد پر فخر و یقین کا عکس ضرور نمایاں رہے گا۔ فیضؔ کے تراجم سے جدید عربی شعرا کو یوں محسوس ہوا جیسے فیضؔ بھی ان ہی میں سے ہیں۔ پھر دیگر مشترکہ اجزا نے انہیں فلسطینیوں سے اور قریب کر دیا۔

جدید فلسطینی شعراء کے یہاں نظم کی جدید ہیئتوں پر اصرار ملتا ہے۔ ان کے یہاں 'کمٹ منٹ' کو بہت اہمیت دی جاتی ہے جسے انہوں نے 'التزام' کی اصطلاح سے موسوم کیا ہے۔ 'کمٹ منٹ' یا 'التزام' فیضؔ کا بھی بنیادی مسئلہ ہے۔

قیامِ بیروت نے فیضؔ کو فلسطینیوں کے معاملات و مسائل سے بہت قریب کر دیا۔ بیروت کی دیگر شہرتیں اپنی جگہ لیکن مصر، شام، عراق اور دیگر ممالک کے جلاوطن شعراء کے لیے وہ ایک جنت سے کم نہیں تھا۔ شعرا یہاں مختلف الوطن ہونے کے باوجود خود کو متحد الخیال محسوس کرتے تھے۔ جب فیضؔ نے بیروت کے بارے میں ایک نظم کہی کہ۔

بیروت نگارِ بزمِ جہاں
بیروت بدیلِ باغِ جناں
بچوں کی ہنستی آنکھوں کے
جو آئنے چکنا چور ہوئے
اب ان کے ستاروں کی لو سے
اس شہر کی راتیں روشن ہیں
اور رخشاں ہے ارضِ لبناں

....

....

یہ شہر ازل سے قائم ہے
یہ شہر ابد تک دائم ہے

بیروت نگارِ بزمِ جہاں

بیروت بدیلِ باغِ جناں

تو یہ ایک خوب صورت جدید شہر کی قصیدہ خوانی نہیں تھی بلکہ اس کی علامتی اور معنوی حیثیت کا ایک نادر شاعرانہ اظہار تھا۔

البیاتی نے اپنی کتاب 'کلمات لایموت' (الفاظ جو کبھی نہیں مرتے) میں ایک نظم ٹی ایس ایلیٹ کے لیے لکھی ہے جس میں اس نے ایلیٹ کی ویسٹ لینڈ پر طنز کیا ہے۔ اس کے خرابے میں نہ کوئی شاعر ہے نہ عاشق، نہ شہید ہے نہ کوئی قطرۂ آب۔ ایلیٹ کا خرابہ اجنبیوں اور آسیبوں کا مسکن ہے۔ پھر آخر میں البیاتی، ایلیٹ کو بیروت آنے کی دعوت دیتا ہے کہ یہاں آؤ اور زندگی کی حقیقی جدوجہد کا ذائقہ چکھو۔

فیض نے قیامِ بیروت کے زمانے میں زندگی کی حقیقی جدوجہد کا ذائقہ اپنے سارے وجود میں محسوس کیا جس کی گواہی ان کی وہ نظمیں وہ غزلیں ہیں جو انہوں نے فلسطینیوں کی جدوجہدِ آزادی اور بے مثال قربانیوں کے سلسلے میں لکھیں۔ جون ۱۹۸۲ء میں اسرائیل نے لبنان پر حملہ کر کے بیروت پر قبضہ کر لیا۔ پی ایل او کو بیروت سے اپنا مستقر ہٹانا پڑا۔ حزیران کا تجربہ ۱۹۶۷ء تک رہا اس کے بعد کی شاعری فلسطینی مقاومت اور المیہ بیروت کے ایک نئے رخ کو ظاہر کرتی ہے۔ جس میں تلخی، تڑپ اور شکایت کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ ایک مشہور فلسطینی شاعر خلیل حاوی جو بیروت یونیورسٹی میں عربی ادبیات کے استاد تھے، ۱۹۸۲ء میں اسرائیل کے قبضۂ بیروت سے اس قدر دل برداشتہ ہوئے کہ انہوں نے خودکشی کر لی۔ نزار قبانی، فدوی طوقانی، سمیح القاسم، معین بسیسو، راشد حسین، محمود درویش، صالح نیازی، سعدی یوسف وغیرہ نے جدید مزاحمتی شاعری میں نمایاں کارنامے انجام دیے ہیں۔ سیاست دان اسٹریٹیجی پر جان چھڑکتا ہے۔ جب کہ شاعر کے سامنے اپنے آدرش کی حرمت اور نظریے کی کلیت ہوتی ہے جس کی فتح میں کسی گروہ یا پارٹی کی نہیں بلکہ سارے عالمِ انسانیت کی فتح مضمر ہے۔ یہ نقطۂ نظر جدید عرب اور فلسطینی شعرا کی شاعری کا کلیدی نکتہ ہے۔ فیض احمد فیض کی شاعری اس طرزِ فکر کی ایک انتہائی سلیقہ مندانہ اظہار ہے۔ آخری دور میں فیض نے نہ صرف شاعرانہ اور نظریاتی حیثیت سے بلکہ عملی حیثیت سے بھی خود کو فلسطینیوں کی جدوجہدِ آزادی سے وابستہ کر لیا تھا اور ان کا انجام اس ایقان پر ہوا۔

ہم جیتیں گے
حقا ہم اِک دن جیتیں گے
بالآخر اِک دن جیتیں گے

(ایک ترانہ مجاہدینِ فلسطین کے لیے)

فیضؔ کے منظوم تراجم

دنیا کی ہر زبان میں تراجم کی خاص اہمیت رہی ہے قدیم یونان، روم، ایران، ہندوستان اورعرب ممالک میں پورے پورے عہد تراجم سے وابستہ رہے ہیں، کیونکہ کسی بھی علاقے میں علم وآ گہی کے جو مآخذ موجود ہیں ان کے ذریعے نہ فرد کو مکمل طور پر سمجھا جاسکتا ہے اور نہ سماج اور کائنات کو۔ پورے انسانی فکر کا ارتقا کسی ایک قوم یا ایک زبان کے بولنے والوں پر مشتمل نہیں۔ ساری انسانیت نے اپنے اپنے خطے میں اپنے اپنے ماحول، مزاج اور ذہنی ضرورت کے تحت زندگی اور کائنات کا مطالعہ کیا ہے اور اس طرح فکرِ انسانی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کے جو طریقے رہے ہیں ان سے ہر عہد نے دوسرے عہد سے اور ہر زبان نے دوسری زبانوں سے علم وآ گہی کے استفادے کی صورت ہمیشہ برقرار رکھی ہے۔ دنیا کے کلاسیکی ادب کا تمام زبانوں پر اتنا گہرا اثر ہے کہ اس کے بغیر جدید تخلیقات کو بھی وہ وقار اور وزن حاصل نہیں ہوسکتا جو ان چراغوں کی روشنی سے حاصل ہوا ہے۔

خود ہمارے برصغیر میں تراجم کی روایت ہر دور میں رہی ہے۔ مغل سلطنت میں کئی ایسے شاہکار ترجمے کے ذریعے ہماری تہذیب کا حصہ بنے کہ جو ترجموں کے بغیر شاید ہم تک پوری طرح پہنچ نہ سکتے تھے۔ ان میں 'پنچ تنتر' کا ترجمہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا سب سے پہلا ترجمہ عباسی عہد میں مامون الرشید کے زمانے میں 'کلیلہ ودمنہ' کے نام سے ہوا تھا۔ اس کے بعد فارسی میں 'انوارِ سُہیلی' اور 'عیارِ دانش' کے عنوان سے برصغیر میں بھی اسے بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ پھر جب لکھنؤ کا دبستان معرضِ وجود میں آیا تو جوش ملیح آبادی کے پردادا نواب فقیر محمد خان گویا نے 'بستان

حکمت‘ کے نام سے اردو میں اس کا ترجمہ پیش کیا۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد ’خرد افروز‘ کے نام سے اس کا ترجمہ ایک طرح کی جدید اردو میں ہوا۔ یہ تو محض ایک کتاب کا احوال ہے۔ اس کے علاوہ بے شمار مذہبی تاریخی اور سائنسی موضوعات پر تراجم ہوئے۔ حیدر آباد دکن میں ’شمس الامرا‘ کے دائرہ شمسیہ، دِلّی کالج کے تراجم اور سرسیّد احمد خان کی سائنٹفک سوسائٹی کے ذریعے جدید علوم کی کتابوں کے ترجمے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

اسی ضمن میں جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ کی تاریخی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ترجمے کی اس تھوڑی سی جھلک سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ صرف مسلمانوں ہی کے افکار کو نہیں بلکہ ویدانت اور ’اُپنشد‘ اور ’بھگوت گیتا‘ کے تراجم بھی بڑی تعداد میں منظرِ عام پر آئے۔ داراشکوہ نے ’اُپنشد‘ کا ترجمہ فارسی زبان میں ’سرِ اکبر‘ کے نام سے کیا تھا۔ یہ پس منظر ذہن میں اس وقت تازہ ہوا جب فیض احمد فیضؔ کے منظوم تراجم کا ایک مطالعہ کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اب تک تو نثری ترجموں کا ذکر ہوا لیکن سب سے مشکل کام شاعری کا شاعری میں ترجمہ ہے، اس کی بابت کئی قول عالمی سطح پر بطور حوالہ پیش کیے جاتے ہیں۔ ایک یہ ہے:

> 'Translation of poetry is like a woman. If she is beautiful, not faithful. It faithful, she is not beautiful.'

اسی طرح رابرٹ فراسٹ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ’شاعری کا ترجمہ کرنے کے بعد جو چیز ترجمے میں آنے سے رہ جاتی ہے وہی اصل شاعری ہوتی ہے۔ جزوی اعتبار سے یہ اقوال درست نظر آتے ہیں، لیکن ایسا بھی نہیں کہ شاعری کا شاعری میں ترجمہ ہمیشہ ناقص ہی رہا ہو۔ اس کا بڑا تعلق ترجمہ کرنے والے کی صلاحیت، علم و دانش اور زبانوں سے مکمل واقفیت کے علاوہ اس امر سے بھی ہے کہ اسے اپنی زبان اور جس زبان سے ترجمہ کیا جا رہا ہے اس میں کوئی مماثلت نظر آتی ہے یا نہیں، مثلاً ہند یورپی زبانوں میں اور ہند آریائی زبانوں کا ہند آریائی زبانوں میں منظوم ترجمہ زیادہ بعید نہیں ہوتا۔ یہ امر فارسی اور اردو پر بھی صادق آتا ہے کہیں کہیں بالکل لفظ ترجمے ہو گئے ہیں اور کہیں مفہوم کو اپنے طرزِ احساس اور کلچر کے مطابق ڈھال دیا ہے۔ مثلاً فارسی کا ایک شعر ہے۔

زِفرق تابقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامِ دل می کشد کہ جا اینجاست

اس شعر کو میرؔ تقی میرؔ نے اپنے انداز میں یوں لکھا ہے۔

سراپا پہ جس جا نظر کیجیے
وہیں عمر ساری بسر کیجیے

کیفیت اور 'عمر ساری بسر کیجیے' کے الفاظ نے میرؔ کے شعر کا تاثر اصل شعر سے بڑھا دیا ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اصل شعر کی روح قبض ہو گئی ہے۔ کبھی کبھی تو خود شاعر اپنے شعر کا ترجمہ بھی ہو بہو نہیں کر پاتا۔ غالبؔ کا شعر ہے۔

کس ندانست کہ بر غالبؔ ناکام چہ رفت
می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

اب اردو میں غالبؔ ہی کا شعر ہے۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

غالبؔ کے اردو شعر میں 'ہم بھی کیا یاد کریں گے' کا لہجہ اصل فارسی میں مفقود ہے تو اس طرح شعر کا شعر میں ترجمہ کبھی اصل سے کم کبھی اصل سے برابر اور کبھی اصل سے بہتر بھی ہو سکتا ہے۔

فیضؔ نے جو منظوم تراجم کیے ہیں ان کا پہلا عکس یا نقش 'سروادیٔ سینا' میں نظر آتا ہے۔ اسی میں وی۔جی کیرنن کا ایک مضمون فیضؔ کے بارے میں بھی ہے وہ لکھتے ہیں:

'میری ہمیشہ یہ خواہش بھی رہی ہے کہ وہ دوسرے ممالک کی بعض نظمیں خصوصاً ہمارے عہد کی ترقی پسند شاعری کا ترجمہ اردو میں کریں جو اس روایت یا علمی تحریک سے تعلق رکھتی ہیں جس سے خود اب ان کی شاعری وابستہ ہے۔ ویسے جارج باروخ، جنہوں نے آئرستان، ڈنمارک اور دوسرے علاقوں کی شاعری کو انگریزی زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے، اپنی ایک کتاب Lavengrow میں لکھتے ہیں کہ ''ترجمہ زیادہ سے زیادہ ایک بازگشت ہی ہوتا ہے۔ تمام ترجمہ کرنے والے یقیناً یہی محسوس

کرتے ہوں گے لیکن کچھ نہ ہونے سے بازگشت بھی بہر حال بہتر ہے اور فیض کی پیدا کردہ بازگشت کم از کم مترنم ضرور ہوگی۔''

(بحوالہ 'سرِ وادیٔ سینا')

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ فیضؔ نے جو دوسرے ممالک کے شعرا کے منظوم تراجم کی طرف توجہ دی اس میں سراسر فرمائشوں کا دخل تھا کیونکہ فیضؔ خود بھی چاہتے ہوں گے کہ ان کے پسندیدہ شعرا کا کلام منظوم ترجمے کی صورت میں ان کے اپنے قارئین تک بھی پہنچے۔ روس کے مختلف دوروں کے دوران ان کی ملاقات سابق سوویت یونین کے متعدد اہم شعرا سے ہوئی جس کا تذکرہ ان کی یادوں کے مجموعے 'مہ و سالِ آشنائی' میں ہے۔ ان ہی میں داغستان کے ملک الشعرا رسول حمزہ بھی شامل ہیں جن سے فیضؔ صاحب کے ذاتی مراسم تھے۔ ان کی شاعری کے علاوہ ان کی یادوں اور آپ بیتی پر مشتمل کتاب 'میرا داغستان' اردو اور انگریزی میں متعدد بار شائع ہو چکی ہے۔

اپنے تراجم کے بارے میں فیضؔ نے ایک روسی رسالے کو انٹرویو دیا تھا جو ۱۹۷۵ء میں روسی زبان میں شائع ہوا۔ فیضؔ صاحب نے بتایا:

'پہلے میں نے کبھی ترجمہ نہیں کیا تھا۔ اب سچ پوچھیے تو یہ بات میری سمجھ سے باہر تھی کہ کیونکہ اس ناقابلِ عبور دیوار کو پار کیا جائے جو دو قطعی مختلف چیزوں کے درمیان کھڑی ہے۔ ایک تو وہ جو خود اپنے بطن میں پیدا ہوئی اور بڑی تکلیف کے ساتھ بڑھی اور پختہ ہوگئی اور دوسری وہ جو فقط پڑھی گئی ہے، شاید وہ حیرت اور وجد کا بھی باعث کیوں نہ بنی ہو__ پھر بھی تین چار سال پہلے اچانک ہی رسول حمزہ کے چند اشعار کا ترجمہ ہوا اور یہ خود میرے لیے غیر متوقع بات تھی__ کچھ یوں لگا گویا میں نے کسی کے بتائے ہوئے موضوع پر فی البدیہہ شعر کہے۔ یہ نیا تجربہ کافی دلچسپ لگا۔ مجھے ترجموں میں نئی خوشی محسوس ہونے لگی۔ جلد ہی یہ بات سمجھ میں آئی کہ رسول کے ترجمے کی پُرمسرت آسانی صرف حسنِ اتفاق اور ایک استثنائی بات تھی لیکن اس کے باوجود یہ کام میں چھوڑنے والا نہیں ہوں۔'

(پرورش لوح و قلم)

ترجمہ: اسامہ فاروقی، لدمیلا وسیلیوا، ص ۲۶۵

فیض نے تراجم کے لہجے اور مضمون میں شعریت کا خاص خیال رکھا ہے اور اس طرح کا ترجمہ کیا ہے کہ پوری اردو شاعری کا مزاج اس میں جھلکنے لگا ہے۔ ایسا ہی بڑا کام علامہ اقبالؔ اپنے زمانے میں کر چکے ہیں۔ انہوں نے ولیم کوپر، ٹینی سن، ورڈزورتھ اور شیلے کی شاعری پر خصوصی توجہ دی۔ چند منظومات کا تو مکمل ترجمہ ہے جیسے 'والدہ مرحومہ کی تصویر دیکھ کر' 'گورستان شاہی' اور آرنلڈ کی نظم 'نالۂ فراق' اس کے علاوہ بھی بعض مغربی شعرا کے کلام سے اخذ تراکیب اور تماثیل کے طور پر اقبالؔ نے تخلیقی سطح پر استفادہ کیا ہے۔ یقیناً اقبالؔ جتنے عظیم شاعر تھے ان کے تراجم یا اخذ کردہ بازگشت میں ان کی شاعرانہ عظمت بھی جھلکتی ہے۔ فیض کے تراجم کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً ان کی یہ نظم جو رسول حمزہ کا ترجمہ ہے۔

برکھا برسے چھت پر
میں تیرے سپنے دیکھوں
برف گرے پربت پر
میں تیرے سپنے دیکھوں
صبح کی نیل پری
میں تیرے سپنے دیکھوں
کوئل دھوم مچائے
میں تیرے سپنے دیکھوں

اس طرح فیضؔ نے جتنے ترجمے رسول حمزہ کے کیے ہیں ان میں کسی پر بھی ترجمے کا گمان نہیں ہوتا کیونکہ لفظیات اور ماحول ہمارے اپنے لسانی اور تہذیبی ماحول اور روایات سے تعلق رکھتا ہے۔ داغؔ نے اِک شعر یوں کہا ہے۔

بات بھی کرنی انہیں آتی نہ تھی
یہ ہمارے سامنے کی بات ہے

ب اس ترجمے کو دیکھیے جس کا عنوان ہے 'داغستانی خاتون اور شاعر بیٹا'۔

اس نے جب بولنا نہ سیکھا تھا
اس کی ہر بات میں سمجھتی تھی

اب وہ شاعر بنا ہے نامِ خدا
لیکن افسوس کوئی بات اس کی
میرے پلے ذرا نہیں پڑتی

روس کے کئی شعرا جنگجو بھی رہے ہیں خاص طور پر حریفانہ شمشیر زنی (dual) کی روایت رہی ہے۔ بلکہ روس کے انتہائی ممتاز شاعر الیگزنڈر پشکن کا تو بڑا معرکہ رہا ہے۔ چنانچہ اکثر روسی شعرا کے ہاں شمشیر زنی کے مضامین خوبصورتی سے ادا ہوئے ہیں۔ فیضؔ نے رسول حمزہ کی ایسی ہی ایک نظم کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

میرے آباء کہ تھے نامحرمِ طوق و زنجیر
وہ مضامیں جو ادا کرتا ہے اب میرا قلم
نوکِ شمشیر پہ لکھتے تھے بہ نوکِ شمشیر
روشنائی سے جو میں کرتا ہوں کاغذ پہ رقم
سنگ وصحرا پہ وہ کرتے تھے لہو سے تحریر

رسول حمزہ کی شاعری میں طنز اور ظرافت کا پہلو بھی خاص نمایاں ہے۔ فیضؔ نے ایسی نظموں کے تراجم بھی کیے ہیں ان میں 'سالگرہ' اور 'کتبہ' بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ اصل طنز اور مزاح کے پہلو کو فیضؔ نے کمال فن سے اپنے یہاں برقرار رکھا۔

سالگرہ

شاعر کا جشن سالگرہ ہے، شراب لا
منصب، خطاب، رتبہ انہیں کیا نہیں ملا
بس نقص ہے تو اتنا کہ ممدوح نے کوئی
مصرعہ کسی کتاب کے شایاں نہیں لکھا

کتبہ

جواں مردی اسی رفعت پہ پہنچی
جہاں سے بزدلی نے جست کی تھی

اس کے علاوہ جو نظم 'نسخۂ الفت میرا' کے عنوان سے ترجمہ کی گئی ہے وہ تو سراسر خود فیضؔ ہی کا

کلام معلوم ہوتا ہے ۔

گر کسی طور ہر اِک الفتِ جاناں کا خیال
شعر میں ڈھل کے ثنائے رخِ جانانہ بنے
پھر تو یوں ہو کہ مرے شعر و سخن کا دفتر
طول میں طولِ شبِ ہجر کا افسانہ بنے
ہے بہت تشنہ مگر نسخۂ الفت میرا
اس سبب سے کہ ہر اِک لمحۂ فرصت میرا
دل یہ کہتا ہے کہ ہو قربتِ جاناں میں بسر

فیضؔ نے قدرتی طور پر ایسے شعرا کا کلام ترجمے کے لیے منتخب کیا جو ان کے نظریے سے ہم رشتہ تھے اور ان میں وہ شعرا شامل ہیں جن سے فیضؔ کے ذاتی مراسم بھی تھے۔ ان میں ترکی کے ایک شہرۂ آفاق شاعر ناظم حکمت کا نام بطورِ خاص اہم ہے۔ ناظم حکمت نے پہلی جنگِ عظیم کے دوران ترکی میں ہونے والی جنگِ آزادی میں حصہ لیا اور بعد میں بیشتر زندگی قید و بند میں بسر کی۔ ان کی وفات ۱۹۶۳ء میں اپنے ملک سے دور جلاوطنی کے عالم میں ہوئی۔ ناظم حکمت کا خاصا قیام روس میں رہا۔ ان کی روسی بیوی کا نام ویرا تھا۔ فیضؔ کی طرح ناظم حکمت نے جیل خانے سے اپنی شریکِ حیات کے نام خط لکھے اور کئی نظمیں ویرا ہی کے لیے تخلیق کیں۔ ایک نظم کا عنوان ہے 'زنداں سے ایک خط' فیضؔ نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے ۔

مری جاں تجھ کو بتلاؤں، بہت نازک یہ نکتہ ہے
بدل جاتا ہے انساں جب مکاں اس کا بدلتا ہے!
مجھے زنداں میں پیار آنے لگا ہے اپنے خوابوں پر
جو شب کو نیند اپنے مہرباں ہاتھوں سے
وا کرتی ہے در اس کا
تو آ گرتی ہے ہر دیوار اس کی میرے قدموں پر
میں ایسے غرق ہو جاتا ہوں اس دم اپنے خوابوں میں
کہ جیسے اِک کرن ٹھہرے ہوئے پانی پہ گرتی ہے

فیضؔ نے دیگر شعرا کے ترجموں کی طرح ناظم حکمت کی شاعری کے لیے جو اسلوب سخن اور لفظیات استعمال کی ہیں وہ نہ فیضؔ کے کلام کے لیے اور نہ اردو زبان کے لیے اجنبی محسوس ہوتی ہیں۔ وطن کے بارے میں جس طرح فیضؔ نے سوچا اور اس وطن کے ہجر میں کئی بار ترستے اور تڑپتے بھی رہے، ایسا ہی خاصا بڑا حصہ وطن کے حوالے سے ناظم حکمت کی شاعری میں بھی موجود ہے۔ وطن کے لیے ایک نظم کا ترجمہ فیض نے اس طرح کیا ہے۔

وا میرے وطن

او میرے وطن! او میرے وطن! او میرے وطن!
مرے سر پر وہ ٹوپی نہ رہی
جو تیرے دیس سے لایا تھا
پاؤں میں وہ اب جوتے بھی نہیں
واقف تھے جو تیری راہوں سے
مرا آخری کُرتا چاک ہوا
ترے شہر میں جو سلوایا تھا
اب تیری جھلک
بس اُڑتی ہوئی رنگت ہے میرے بالوں کی
یا جھریاں میرے ماتھے پر
یا میرا ٹوٹا ہوا دل ہے
وا میرے وطن! وا میرے واطن! وا میرے وطن!

'شامِ شہر یاراں' میں ناظم حکمت کے علاوہ قازقستان کے ممتاز نوجوان شاعر اولجز عمر علی سلیمان کی ایک نظم کا ترجمہ 'صحرا کی رات' بھی شامل ہے۔ یہ بھی فیضؔ کے چند خوبصورت ترجموں میں شمار ہوسکتا ہے۔ اس کا آغاز یوں ہوتا ہے۔

کہیں بھی شبنم کہیں نہیں ہے
عجب، کہ شبنم کہیں نہیں ہے
نہ سرد خورشید کی جبیں پر

کسی کے رخ پر، نہ آستیں پر
ذرا سی شبنم کہیں نہیں ہے

اس ترجمے پر فیضؔ کی نظم 'لہو کا سراغ' بے ساختہ یاد آتی ہے۔

کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ

فیضؔ صاحب کے یہاں ملاقاتوں کے دوران روس کے ایک شاعر آندرے وزنسکی کی کتاب 'Anti World' پر نظر پڑی میں اس سے پہلے وزنسکی اور اس کے ہم عصر ایوگینی ایوشینکو کا کلام بہت شوق اور توجہ سے پڑھ چکا تھا۔ آخر الذکر شاعر کے تراجم بھی میں نے کیے ہیں۔ یہ دونوں شاعر اسٹالن کے دورِ جبر کی پیداوار ہیں اور اس کے اینٹی سیمیٹک (Anti-semitic) رویے کے خلاف شعر لکھتے رہے۔ میں نے فیضؔ صاحب سے عاریتاً Anti World پڑھنے کے لیے مانگی چاہی انہوں نے مسکرا کر کہا کہ بھائی ایک تو اپنے دستخط سے اس شاعر نے یہ کتاب مجھے دی ہے دوسرے میں اس کی چند نظموں کا ترجمہ بھی کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی جب کچھ دنوں کے بعد 'سوچنے دو' کے عنوان سے فیضؔ نے ایک خوب صورت نظم لکھی جس پر وزنسکی کی نظم کا گہرا اثر ہے۔ پیرایہ بیان فیضؔ کے اسلوبِ سخن کے عین مطابق ہے۔

ہم سے اُس دیس کا تم نام ونشاں پوچھتے ہو
جس کی تاریخ نہ جغرافیہ اب یاد آئے
اور یاد آئے تو محبوبِ گذشتہ کی طرح
روبرو آنے سے جی گھبرائے

یہ پیرایہ بالکل فیضؔ کے اپنے تخلیقی مزاج کے مطابق ہے۔ اس ترجمے میں یہ مصرعے بھی آخر میں موجود ہیں۔

دل سے مل آتے ہیں بس رسم نبھانے کے لیے
دل کی کیا پوچھتے ہو
سوچنے دو

ان مصرعوں پر خود فیضؔ کی کئی نظموں کے ٹکڑے یاد آتے ہیں مثلاً۔

دل سے پھر ہوگی مری بات کہ اے دل اے دل

فیض کے ایک مجموعے 'مرے دل مرے مسافر' میں قفقاز کے شاعر قاسن قلی سے مستفاد دونوں نظمیں بھی شامل ہیں۔ ایک کا عنوان ہے 'شاعر لوگ' اور دوسری کا 'شوپین کا نغمہ بجتا ہے'۔ پہلی نظم کا ترجمہ فیض کی مشہور نظم 'ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے' کے آہنگ میں ترجمہ کی گئی ہے۔

ہر اِک دور میں ہر زمانے میں ہم
زہر پیتے رہے گیت گاتے رہے
جان دیتے رہے زندگی کے لیے
ساعتِ وصل کی سرخوشی کے لیے

....

اپنے نغمے سلاخوں سے چھنتے رہے
خونچکاں دہر کا خونچکاں آئینہ
دکھ بھری خلق کا دکھ بھرا دل ہیں ہم
طبعِ شاعر ہے جنگاہ عدل و ستم
منصفِ خیر و شر حق و باطل ہیں ہم

دوسری نظم پولینڈ کے ممتاز نغمہ ساز شوپین کے بارے میں ہے۔ اس میں بھی فیض نے اپنے کلچر کو بڑی خوبی سے ترجمے میں برقرار رکھا ہے جیسے یہ مصرعے۔

اک کونج کو سکھیاں چھوڑ گئیں آکاش کی نیلی راہوں میں
وہ یاد میں تنہا روتی تھی، لپٹائے اپنی بانہوں میں
اِک شاہیں اس پر جھپٹا ہے
شوپیں کا نغمہ بجتا ہے

فیض کا لسانی شعور بہت گہرا اور وسیع تھا۔ انہیں کسی دور میں بھی کسی خاص ڈکشن پر اصرار نہیں رہا۔ لیکن جو ڈکشن ان کی پہچان بنا ہے وہ خود ان ہی کا وضع کردہ ہے۔ یہی اسلوب ان کے تراجم میں بھی نظر آتا ہے۔ ہندی، فارسی، عربی اور پنجابی کے بھی بعض الفاظ وہ نہایت تخلیقی انداز میں استعمال کرتے ہیں اور وہ الفاظ و تراکیب ان کی شاعری میں کبھی انمل بے جوڑ معلوم نہیں ہوتے۔ ترجمے کی خوبیوں کے علاوہ لسانی اعتبار سے بھی فیض کے تراجم کا مطالعہ ایک خاص زاویہ رکھتا ہے

جسے فیضؔ شناس نظر انداز نہیں کر سکتے۔

فیضؔ نے جو منظوم تراجم کیے ہیں ان کے محرک زیادہ تر ان شعرا سے فیضؔ کی قربتیں اور ان کے کلام میں جاذبیت و دلکشی کا عنصر تھا۔ یہ سب خوبیاں علامہ اقبالؔ کے فارسی کلام میں بھی ہیں لیکن شاید اس کی ضرورت فیضؔ نے کبھی محسوس نہیں کی کہ اقبالؔ کے چیدہ چیدہ فارسی کلام کو اردو میں منتقل کیا جائے، لیکن جب اقبال اکادمی کی جانب سے ان سے 'پیام مشرق' کا منظوم ترجمہ کرنے کی فرمائش کی گئی تو کافی پس و پیش کے بعد انہوں نے قبول کر لیا۔ فیضؔ کو اس امر کا احساس تھا کہ:

> اردو اور فارسی میں قربت کے باوجود اظہار و آہنگ کے پیرائے کافی مختلف ہیں۔ فارسی زبان کو تراکیب اور مشتقات کی وجہ سے اجمال و اختصار کی جو سہولتیں حاصل ہیں وہ اردو میں موجود نہیں اس لیے اگر ترجمے میں مفہوم اور معانی کے علاوہ اوزان اور قوافی اور اثرات و آہنگ میں بھی اصل سے تطابق کی سعی کی جائے تو کافی دقتیں پیش آتی ہیں'
>
> پیش لفظ
> 'انتخاب پیامِ مشرق'
> ترجمہ: فیض احمد فیضؔ

فیضؔ کے ترجمۂ اقبال میں ترجمے کی کوئی ایک روش موجود نہیں ہے، کہیں تو بالکل لفظی ترجمہ اصل قافیے اور ردیف کے ساتھ ہوا ہے۔ مثلاً

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
(اقبالؔ)

عشق للکارا کہ اِک خونیں جگر پیدا ہوا
حسن لرزاں تھا کہ اِک صاحبِ نظر پیدا ہوا
(فیضؔ)

کہیں اشعار کے مفہوم کو مجموعی طور پر اخذ کر کے اصل قوافی کے ساتھ نظم کر دیا ہے۔ مثلاً

اے کہ از خمخانۂ فطرت بجا مم ریختی
زآتشِ صہبائے من بگذار مینائے مرا
عشق را سرمایہ ساز از گرمیٔ فریادِ من
شعلۂ بیباک گرداں خاکِ سینائے مرا
چوں عبیرم از غبارِ من چراغ لالہ ساز
تازہ کن داغ مرا، سوزاں بصحرائے مرا
(اقبالؔ)

اے کہ تو نے مجھ کو بخشی ہے خمِ فطرت سے مے
ہاں اسی مے کی تپش پگھلائے پیمانہ مرا
ذرہ ذرہ میرے تن کا شعلہ بیباک ہوا
تیز ہو میری نوا سے عشق مستانہ مرا
خاک تربت سے مری روشن چراغ لالہ کر
میرے دل کے داغ سے تاباں ہو ویرانہ مرا
(فیضؔ)

اقبالؔ کے فارسی کلام کو فیضؔ نے کس کس زاویے سے دیکھا اور اردو میں کس حد تک کامیابی سے منتقل کیا اس کا اندازہ دو چار مثالوں سے نہیں بلکہ 'انتخاب پیامِ مشرق' کے مکمل مطالعے سے ہوسکتا ہے۔ البتہ انہوں نے جو غایت بیان کی ہے وہ ہر لحاظ سے اہمیت رکھتی ہے۔

'ترجمہ اچھا برا جیسا بھی ہو ان پرستارانِ اقبال کی جو فارسی زبان سے ناآشنا ہیں، اس کتاب کے افکار و معانی تک کچھ نہ کچھ رسائی ضرور ہو سکے گی۔'

فیض کے منظوم ترجمے جہاں ان کی مختلف اہم شعرا سے دلچسپی کو ظاہر کرتے ہیں وہیں ان کی شعرگوئی کے مختلف زاویے بھی اجاگر ہوتے ہیں۔ مطالعۂ فیضؔ کے متعدد گوشے ہمارے سامنے ہیں اور ان پر ناقدین اور قارئین برابر توجہ دیتے ہیں لیکن تراجم کا گوشہ بھی فیضؔ شناسی میں خاص اہمیت رکھتا ہے اور بعض ترجموں کو تو خود فیض نے بھی اپنے لیے فخر کا باعث سمجھا ہے۔

'نقشِ فریادی'__ ایک مطالعہ

'نقشِ فزیادی' صرف اس لیے اہم نہیں ہے کہ یہ فیض احمد فیض کا پہلا مجموعۂ کلام ہے بلکہ اس کی اہمیت اس وجہ سے اور بھی ہے کہ 'نقشِ فریادی' سے اردو شاعری میں ایک ایسا تغیر اور انقلاب آیا جو شاید اس وقت تو اس قدر محسوس نہ کیا گیا ہو لیکن اب اس کی اشاعت کے ۳۱ سال بعد یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ 'نقشِ فریادی' نے اردو شاعری کو جس نئی فضا سے روشناس کرایا تھا اس کی جھلکیاں گذشتہ تیس برس کی اردو شاعری میں جابجا نظر آتی ہیں اور فیض کا یہ دعویٰ قطعاً درست ثابت ہوتا ہے۔

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

یوں تو فیض کی پوری شاعری نے اور ان کے ہر نئے مجموعۂ کلام نے اپنا بھرپور تاثر اردو شاعری پر مرتب کیا ہے لیکن 'نقشِ فریادی' میں انہوں نے جو اسالیبِ شعری، مضامین اور محاسنِ سخن متعارف کرائے ہیں وہ آج بھی تاریخی اہمیت کے حامل ہیں اس لحاظ سے فیض کا کوئی مجموعہ 'نقشِ فریادی' کی اجتہادی حیثیت کو نہیں پہنچ سکتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ 'دستِ صبا' سے لے کر 'سروادی سینا' تک جب بھی فیض کا نیا مجموعہ شائع ہوا نقادوں نے تحریراً اور ادبی حلقوں نے زبانی یہ ردِ عمل ظاہر کیا کہ ہر نیا مجموعہ اپنے ماسبق مجموعے کے مقابلے میں کمزور تھا۔ میں ان نقادوں اور ادبی حلقوں کی رائے سے متفق نہیں ہوں لیکن ان کے اس ردِ عمل کے پیچھے غالباً 'نقشِ فریادی' کا وہی اجتہادی رنگ ہوگا جو پوری اردو شاعری سے مختلف نظر آتا ہے۔

'نقشِ فریادی' کی ترکیب اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ فیض کو غالب سے کس قدر گہرا ربط

ہے۔ غالبؔ کے دیوان کے پہلے شعر کے پہلے دولفظوں کو گویا فیضؔ نے اپنے عہد کے انسان کی سماجی اور داخلی کشمکش اور جبر کا استعارہ بنا دیا ہے۔ اس زمانے کی غزلوں یا نظموں پر غالبؔ کا اثر اس قدر نمایاں نہیں جتنا کہ بعد میں ہوا لیکن کہیں کہیں اثر پذیری کا بہت واضح انداز ملتا ہے۔ مثلاً یہ شعر۔

اپنی نظریں بکھیر دے ساقی
مئے باندازۂ خمار نہیں

اس سے غالبؔ کا یہ شعر ذہن میں تازہ ہو جاتا ہے۔

دیتے ہیں جنت حیاتِ دہر کے بدلے
نشہ باندازۂ خمار نہیں ہے

اسی طرح۔

تیری رنجش کی انتہا معلوم　　　حسرتوں کا مری شمار نہیں

پر غالبؔ کے اس مصرعے کا پرتو نظر آتا ہے۔

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد

لیکن فیضؔ نے جہاں کہیں غالبؔ، میرؔ، سوداؔ یا مصحفیؔ کا اثر قبول کیا ہے ان کا انداز تخلیقی اور ان کے اپنے لب و لہجے کی چھاپ لیے ہوئے ہے، شاید اسی لیے فیضؔ کسی شعری رویّے کے مقلّد نہیں معلوم ہوتے اور نہ ان کے یہاں کسی شاعر کی بازگشت ایک الگ تشخص لے کر ابھرتی ہے۔

'نقشِ فریادی' کے دو حصے ہیں۔ حصہ اوّل میں جو نظمیں اور غزلیں ہیں وہ اپنی رومانی فضا کی وجہ سے اس عہد کی مروّجہ شعری اسالیب کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔ اس دور کی غزلوں میں بھی اس قسم کے شعر ملتے ہیں جو روایتی غزل سے انحراف اور ایک جدید ذہن کے رویّے کو ظاہر کرتے ہیں۔

میری خاموشیوں میں لرزاں ہے　　　میرے نالوں کی گم شدہ آواز
ہو چکا عشق اب ہوس ہی سہی　　　کیا کریں فرض ہے ادائے نماز
اپنی تشکیل کر رہا ہوں میں　　　ورنہ تجھ سے تو مجھ کو پیار نہیں

پھر یہ شعر تو اردو شاعری کی روایت کے پس منظر میں خاصا Paradoxical لگتا ہے۔

عشق دل میں رہے تو رسوا ہو　　　لب پہ آئے تو راز ہو جائے

میرؔ نے کہا تھا 'لب تک آئی ہوئی پرائی بات'۔ اور یہاں یہ تصور ہے کہ عشق کے اظہار ہی سے عشق راز بنے گا کیونکہ عشق کے آدرش میں شریک ہونے والے اس کی تقدیس کو بچانے کی ذمہ داری محسوس کریں گے۔ لیکن اگر عشق کے اس آدرش کی ترسیل نہ ہو تو صرف دل میں رہنے سے رسوا ہوگا۔ اس طرح گویا اس افلاطونی نظریۂ محبت سے بھی بغاوت ہے جس میں اظہارِ محبت اور اظہارِ مدعا کو عشق کی توہین سمجھا جاتا ہے۔

فیضؔ بنیادی طور پر رومانی شاعر ہیں۔ ان کے ذہنی نشو و نما پر اس دور کے رومان پسند ادیبوں اور شاعروں کی نگارشات کا یقیناً اثر ہوا ہوگا لیکن فیضؔ کی شاعری اس رومان سے الگ ہے جسے اخترؔ شیرانی نے عام کیا تھا۔ ان کی رومانیت مغربی شعرا کی رومانیت کا پرتو لیے ہوئے ہے۔ راشدؔ کے یہاں رومان کا وہ انداز ابتدا میں واضح طور پر ملتا ہے جس کا آغاز اخترؔ شیرانی نے کیا تھا مثلاً 'ماورا' میں ان کی یہ نظم جس کا مصرعہ ہے۔

مثالِ خورشید و ماہ و انجم مری محبت جواں رہے گی

راشدؔ نے 'ماورا' میں ہیئت کے تجربے کیے ہیں لیکن ان کا مزاج جدید نہیں ہے۔ 'نقشِ فریادی' میں فیضؔ نے ہیئت کے تجربے کم کیے ہیں لیکن ان کا شعری رویہ جدید اور تازہ کار ہے۔

'آخری خط'، 'حسینہ خیال سے' اور 'سرودِ شبانہ' دھیمی اور مدھم رومانی فضا لیے ہوئے ہیں۔ ان کی فضا کچھ ایسی ہے جیسی براؤننگ، کرسچینا روزیٹی یا ایملی ڈکنسن کی نظموں میں ہے ان کی داخلی گھلاوٹ دیرپا اثر مرتب کرتی ہے۔

'سرود' میں اس عہد کے بدلتے ہوئے مزاج کا پہلا تاثر نظم ہوا ہے جب رومان سے زیادہ زندگی کے تغیر پذیر رشتوں نے متاثر کیا۔ شاید وہ ایک ایسا عہد تھا جس میں نہ موت اپنی تھی، نہ عمل اپنا تھا، نہ جینا اپنا تھا۔ سارا قرینہ شورشِ گیتی میں کھو گیا تھا۔

اس نظم میں یہ دو شعر بھی ملتے ہیں۔

ناخدا دور، ہوا تیز، قریں کامِ نہنگ
وقت ہے پھینک دے لہروں میں سفینہ اپنا

ساقیا رنج نہ کر جاگ اٹھے گی محفل
اور کچھ دیر اٹھا رکھتے ہیں پینا اپنا

اس شعر کی ایک دلچسپ بازگشت فیضؔ کے تازہ ترین مجموعے 'سرِ وادیِ سینا' کی ایک غزل کے اس شعر میں ذرا مختلف استعاراتی فضا لے کر یوں ابھری ہے۔

کوئی دم بادبانِ کشتیٔ صبا کو نہ رکھو　　　ذرا ٹھہرو غبارِ خاطرِ محفل ٹھہر جائے

'یاس' عنوان کے لحاظ سے خواہ کچھ ہی تاثر کیوں نہ دیتی ہو لیکن اس میں تشایم اور بے زاری نہیں بلکہ اس میں اس وقت کے اقدار کی شکست کا بڑا موئژ مرقع پیش کیا گیا ہے۔

اس زمانے میں فیضؔ کی نظموں میں جذبۂ عشق کے ساتھ ساتھ تجزیاتی ذہن بھی ابھرتا نظر آتا ہے۔

مچل رہا ہے رگِ زندگی میں خونِ بہار　　　الجھ رہے ہیں پرانے غموں سے روح کے تار

چلو کہ چل کے چراغاں کریں دیارِ حبیب　　　ہیں انتظار میں اگلی محبتوں کے مزار

محبتیں جو فنا ہوگئی ہیں میرے ندیم

محبت کے اس تجزیے کے بعد جذبے پر شعور کو فوقیت حاصل ہو جاتی ہے اور یہیں سے 'نقشِ فریادی' کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔ اس حصے ہی سے دراصل اس دعوے کی دلیل ملتی ہے کہ فیضؔ کا یہ مجموعہ شاعری کی دنیا میں اجتہادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس حصے کی پہلی نظم

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

اردو نظم کی تاریخ میں ایک قابلِ رشک اضافہ بن چکی ہے۔ 'میری محبوب' کی ترکیب پر تو اب بھی کبھی کبھی اجنبی ہونے کا گمان گذرتا ہے کیونکہ اردو شاعری میں تو میرے محبوب ہی کا رواج رہا ہے۔ اگرچہ فیضؔ نے ایک جگہ اس ضمن میں یہ مشورہ دیا ہے کہ اگر آپ خاتون ہیں تو پڑھیے 'مرے محبوب نہ مانگ'۔

یہیں سے فیضؔ کے اس contribution کا آغاز ہوا جو اب تنقید میں cliche کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ یعنی غمِ جاناں اور غمِ دوراں کی تفریق کو مٹا کر ایک ہی تجربے کے دو پہلو بنا دینے کا عمل۔

اس نظم میں یہ آدرش دیا گیا ہے۔

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا　　　راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

انسانی برادری کے دکھ درد کو محسوس کرنا اور ان غموں سے ایک مشترکہ رشتہ تلاش کرنا یہ عمل فیضؔ کی شاعری میں یا بالفاظِ دیگر اردو شاعری میں کب شروع ہوا اس کی مکمل تصویر فیضؔ کی ان ہی نظموں کے مطالعے سے سامنے آتی ہے جو 'نقشِ فریادی' کے دوسرے حصے میں ملتی ہیں۔

'رقیب' کے روایتی مفہوم کو بالکل بدل کر رکھ دیا۔ یہی وہ نظم ہے۔ جس میں رقیب ایک استحصالی طبقے کی علامت اور ایک متحارب قوت کا استعارہ بن کر پہلی بار ایک نئی معنویت کے ساتھ ابھرا ہے۔ یہی وہ نظم ہے۔ جس میں فیضؔ نے غریبوں اور زیر دستوں کی حمایت کو جذبۂ عشق کے مترادف قرار دیا جس کے بعد بازار میں مزدور کا گوشت فروخت ہوتے اور شاہراہوں پر غریبوں کا لہو اُبلتے دیکھ کر۔

آگ اس سینے میں رہ رہ کر ابلتی ہے نہ پوچھ　　　اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

'تنہائی'، 'بول کے لب آزاد ہیں تیرے۔' ایک ایسے دور میں بڑی اچھی مختصر نظموں کی حیثیت رکھتی ہیں جب بالالتزام طویل نظم کہنا ہی نظم نگار کے لیے طرّۂ امتیاز سمجھا جاتا تھا۔

فیضؔ کی ایک انتہائی تلخ طنزیہ نظم 'کتے' ہے جو عنوان سے لے کر آخری مصرعے تک انسانی نفسیات اور انسان کے طبقاتی جبر کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کرتی ہوئی ایک ایسا تاثر چھوڑ جاتی ہے۔ جس سے انسان کی انسانیت اور حساس آدمی کی رگِ حمیت کا پھڑک جانا لازم ہو جاتا ہے۔ نظم کے ابتدائی مصرعے۔

یہ گلیوں کے آوارہ بے کار کتے　　　کہ بخشا گیا جن کو ذوقِ گدائی!

زمانے کی پھٹکار سرمایہ ان کا　　　جہاں بھر کی دھتکار ان کی کمائی

کیا اقبالؔ کے ان مصرعوں کی طنز آمیز پیروڈی نہیں؟

یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے　　　جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا　　　سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

اس وقت فیضؔ نے ان 'آوارہ کتوں' کے لیے یہ نسخہ تجویز کیا تھا کہ اگر انہیں احساسِ ذلت ہو جائے تو وہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چبالیں۔

اس مجموعے میں فیضؔ کی ایک اور اہم اور اردو شاعری کی ایک اعلیٰ نظم 'موضوعِ سخن' بھی ہے۔ 'موضوعِ سخن' رومان اور احیائے رومان کے دور سے نکل کر اسلوب کے اعتبار سے اس شاعری سے اپنا رشتہ جوڑتی ہے جس کا آغاز ایلیٹ سے ہوا اور جسے اپنی اپنی حد تک آڈن، میک نیس، اسپنڈر اور ڈے لیوس نے برتا ہے۔ یہاں فیضؔ اپنے بعض اسالیب میں Imagist اسکول سے بھی متاثر معلوم ہوتے ہیں جو ایذرا پاونڈ اور ہیلڈا ڈولٹل (H.D) کے بنائے ہوئے اصولوں پر عمل پیرا تھا۔ گویا خیالات اور مضامین ترقی پسندانہ تھے اور اسالیبِ شعر جدید مغربی شاعری سے متصف۔

یہاں سے میرے اس دعوے کو تقویت ملتی ہے کہ جدیدیت کو ہمارے یہاں غلط سمجھا گیا ہے اور بے سبب دشنام سے نوازا گیا ہے۔

ہمارے یہاں ان تمام رجحانات کو جدیدیت کا نام دیا جاتا ہے جو بیسویں صدی کی پہلی دہائی سے اب تک مغرب کے شعری ادب میں فروغ پاتے رہے ہیں۔ ان کے یہاں ہر جدیدیت کا ایک الگ نام ہے۔ کبھی وہ اسے سمبلزم کہتے ہیں کبھی امیجزم، سرریلزم، فیوچرزم، موومنٹ، نیوریلزم اور نہ جانے کیا کیا لیکن ہمارے یہاں سب کا جواب لفظِ 'جدیدیت' کے طلسم میں بند ہے۔ بہر حال میں یہ سمجھتا ہوں کہ علامت نگاری یا جدیدیت کے دوسرے اسالیبِ شعر سے کام لے کر یا شاعری کی جدید ہیئتوں اور اصناف کو برت کر بھی ترقی پسند اور با مقصد شاعری کی جا سکتی ہے۔ خود اپولونیئر، لوئی آراگان، لورکا اور پبلو نرودا کی شاعری اس بات کی گواہ ہے کہ نظم کے لیے جدید پیرائے اختیار کرنے کے بعد بھی سماجی شعور اور طبقاتی جدوجہد کی شاعری کی جا سکتی ہے۔ وزنسکی اور ایفتوشنکو کی شاعری جدید معنوں میں انقلابی ہے لیکن اس کا پیرایہ براہِ راست تخاطب کا نہیں ہے۔ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ فیضؔ کے یہاں مغرب کی جدیدیت کے بیشتر دبستانوں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں لیکن وہ پیرہن میں یہ اہتمام رکھتے ہیں کہ دیکھنے والا کہہ اٹھے ؎

من اندازِ قدرت رامی شناسم

جب جدیدیت کو ترقی پسندی کی توسیع کہا جاتا ہے تو اس وقت اسی قسم کی جدیدیت کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ ترقی پسند شاعری میں بھی دو رویے تقریباً ساتھ ہی ساتھ شروع ہوئے تھے۔ اس طرح جدیدیت میں بھی دو رجحان بہت نمایاں ہیں ایک کو آپ افادہ پسند یا با مقصد جدیدیت کہہ سکتے ہیں اور دوسری کو افادہ شکن جدیدیت کا نام دے سکتے ہیں۔

'نقشِ فریادی' کی اہمیت ہمارے لیے یوں اور بھی ہے کہ میرے خیال میں جس طرح ترقی پسند تحریک کے عروج میں اس مجموعے کی بعض نظموں نے شعرا کے خاصے بڑے گروہ کو متاثر کیا اسی طرح ترقی پسندی کی توسیع یا با مقصد جدیدیت کے دور میں بھی اس مجموعے کی بعض نظموں سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔

یہاں میری مراد یہ نہیں کہ فیضؔ نے تیسری دہائی میں جو نظمیں لکھی تھیں اس قسم کی نظمیں اب بھی لکھی جائیں لیکن میں یہ یقیناً کہنا چاہوں گا کہ فیضؔ کی ان نظموں کو پیشِ نظر رکھ کر یہ سوچا ضرور

جاسکتا ہے کہ فیض نے اپنے عہد کی صداقتوں کو پہلے پہل کسی طرح اردو شاعری کی ساری فضا سے الگ کر کے شعری پیکروں میں ڈھالا تھا۔ اس ضمن میں 'نقشِ فریادی' سے زیادہ کوئی اور مجموعہ ہمارے کام نہیں آسکتا۔

۱۴؍اپریل ۱۹۷۲ء

مشمولہ: فیض احمد فیض، 'متاعِ لوح و قلم'، کراچی، دانیال، ۱۹۷۳ء

'دستِ صبا' پر ایک نظر

دنیا کی ہر زبان میں یہ مثالیں مل جاتی ہیں کہ کوئی اہم شاعر اپنی فکر، اسلوب اور موضوعات کو رفتہ رفتہ اس طرح معاشرے کے ذہنوں میں جاگزیں کر دیتا ہے کہ اسے ایک خاص دور میں خاص حوالوں ہی سے پرکھا اور پہچانا جاتا ہے۔ فیض احمد فیضؔ ہماری ادبی تاریخ میں ایسی ہی ایک مثال ہیں۔ ابتدا میں ان کی شاعری کو رومانیت اور جمالیات سے وابستہ رکھ کر دیکھا گیا، اس کے بعد کی شاعری شعوری طور پر اپنی ذات اور ذاتی غم سے مبرا ہو کر پوری انسانیت کے لیے سوچنے اور محسوس کرنے کے دائرے میں داخل ہوگئی اسی لیے ان کی پہلی تخلیقی کاوش جو 'نقشِ فریادی' کے عنوان سے شائع ہوئی واضح طور پر دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے میں وہی قلب و محسوسات کے اظہار کا عکس ملتا ہے اور اس کا دوسرا حصہ جسے فیضؔ نے

'دل بفروختم جانے خریدم'

سے تعبیر کیا ہے۔ یہاں سے ان کی شاعری کا ایک نیا رخ شروع ہوتا ہے۔ 'نقشِ فریادی' اس لحاظ سے اہم ہے کہ ایک تو وہ فیضؔ کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا اور اسی میں ان کی بعض ایسی نظمیں شامل ہوئیں جنہیں آج تک فیضؔ کے طرزِ سخن اور فکری بنیادوں کو سمجھنے کے لیے پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔ 'تنہائی' کے علاوہ 'مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ'، 'موضوعِ سخن'، 'رقیب سے'، 'کتے' جیسی نظمیں اردو میں بالکل نئی فضا سے آشنا کرتی ہیں۔ 'رقیب' کا تصور ہمارے یہاں دشمن، عدو اور عشق میں مخالفانہ اور حریفانہ رخ رکھنے والی ذات کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن فیضؔ جو عربی زبان و ادب سے بھی گہری واقفیت رکھتے تھے انہیں اندازہ تھا کہ عربی معاشرے میں جب

سپاہی یا جنگجو کسی لڑائی کی مہم پر جاتے تھے تو خواتین اور بچوں کی نگرانی کے لیے قبیلے کا کوئی بزرگ موجود ہوتا تھا۔ اسے رقیب کہا جاتا تھا۔ لہٰذا جب فیضؔ نے رقیب کو سفرِ عشق کا ایک شریک مسافر سمجھا اور اس طرح اظہار کیا کہ ؂

'تجھ پہ بھی برسا ہے اس بام سے مہتاب کا نور
جس میں بیتی ہوئی راتوں کی کسک باقی ہے
تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی وہ رخسار وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے
تجھ پہ اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کہ کیوں عمر گنوا دی ہم نے
ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غم الفت کے
اتنے احسان کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں
ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے
جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں

اب یہ بظاہر ایک رومانی نظم ہے لیکن اس میں رقیب شریکِ کار ہے اور عشق وہ نصب العین ہے جس کے لیے جدوجہد کرنے والوں نے عمر گنوا دی اور جو ہم سفر اور شریکِ عمل ہیں وہ حریف نہیں حلیف ہیں۔ اس میں 'موضوعِ سخن' جیسی نظم بھی ہے جس کا آغاز یوں ہوتا ہے ؂

گل ہوئی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہوئی شام
ڈھل کے نکلے گی ابھی چشمۂ مہتاب سے رات
اور مشتاق نگاہوں کی سنی جائے گی
اور ان ہاتھوں سے مس ہوں گے یہ ترسے ہوئے ہات

اس نظم کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں رومانیت اور جمالیات کا پرتو نظر آتا ہے لیکن گریز کے لیے یہ پیرایہ اختیار کیا گیا ہے ؂

آج تک سرخ و سیہ صدیوں کے سائے کے تلے
آدم و حوا کی اولاد پہ کیا گذری ہے

موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں
ہم پہ کیا گزرے گی اجداد پہ کیا گزری ہے؟

فیضؔ کے اس مجموعے کے پہلے ایڈیشن میں ن۔م راشد کی ایک تحریر شامل تھی جو چند اشاعتوں کے بعد حذف کردی گئی۔ 'نقشِ فریادی' کے تقریباً گیارہ سال بعد فیضؔ کا دوسرا شعری مجموعہ 'دستِ صبا' منصۂ شہود پر آیا۔ اس اثنا میں فیضؔ کی ذاتی زندگی اور برصغیر پاک و ہند کی سیاسی، سماجی اور فکری تبدیلیاں وسیع پیمانے پر رونما ہو چکی تھیں۔ آزادیٔ وطن کی جدوجہد جاری تھی۔ ابتدا میں ترقی پسند جماعتوں نے پاکستان کے مؤقف کی حمایت کے سلسلے میں تحفظات سے کام لیا لیکن پھر خود کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے مسلم حقِ خود ارادی کو تسلیم کر کے قیامِ پاکستان کی حمایت کی۔ اس طرح ۱۴ راگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی سرزمین پر آزادی کا پرچم لہرایا۔ فیضؔ اس تمام اجتماعی جدوجہد کا ایک اہم حصہ ہے، لیکن بعض اور اہم شعرا کی طرح جن میں جوشؔ ملیح آبادی، احمد ندیم قاسمی، علی سردار جعفری جیسے نام شامل ہیں۔ آزادی کو فسادات، خونریزی، قتل و غارت گری اور بڑے پیمانے پر ترکِ سکونت جیسے سنگین واقعات سے دوچار ہوتے دیکھ کر محسوس کیا کہ یہ وہ آزادی نہیں ہے جس کا خواب علامہ اقبال، قائداعظم سمیت عام انسانوں نے کبھی دیکھا تھا۔ ان کی نظم 'صبحِ آزادی' اس احساس کا مکمل نمونہ ہے۔

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شب ست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رکے گا سفینۂ غمِ دل

....

ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

اس طرزِ احساس کو عوامی مقبولیت تو حاصل ہوئی لیکن سرکاری صفوں میں کھلبلی مچ گئی اور اندازہ ہوا کہ شاید بائیں بازو کے دانشور آزادی کو منفی رخ سے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی دیگر عوامل تھے جن میں کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کا قیام، انجمن ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیاں اور کشمیر کے محاذ پر پاکستان کا مؤقف وغیرہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انتخابات کی تاریخ کا اعلان اس وقت کے وزیرِ اعظم لیاقت علی خان نے کر دیا۔ لیکن جب یہ اندازہ ہوا کہ کمیونسٹ پارٹی بھی اپنے امیدوار کھڑے کر رہی ہے تو دیگر اسباب کی بنا پر یہ انتخابات ملتوی کر دیئے گئے۔ اسی اثنا میں یہ انکشاف ہوا کہ کچھ فوجی افسر، تین چار شہری اور غیر فوجی دانشوروں کے ساتھ مل کر حکومت کا تختہ الٹنا چاہتے ہیں۔ ایسے تمام ماخوذ افراد کو حراست میں لے لیا گیا اور اسے راولپنڈی سازش کیس کا نام دیا گیا۔ ان میں ایک اہم نام فیضؔ احمد فیضؔ کا بھی تھا۔ اس طرح مارچ ۱۹۵۱ء کو راولپنڈی سازش کیس کی ابتدا ہوئی۔ قید و بند اور اسیری کا یہ تجربہ فیضؔ کے لیے بالکل نیا تھا۔ علم و دانش کی سطح پر تو وہ ان تمام بڑی شخصیتوں کے عزم و عمل اور فکر و خیال سے واقف تھے جنہوں نے دنیا کے حیاتی ادب میں نمایاں اضافہ کیا ہے، لیکن ان کا اپنا یہ تجربہ پہلا تھا اور بقول عزیزؔ لکھنوی ؎

دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا
وہ میرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا

فیضؔ نے خود بھی اپنی یادوں اور خطوط میں اس کا اظہار کیا ہے کہ اسیری کی زندگی اور زنداں کے شب و روز باہر کی زندگی سے بالکل مختلف ہوتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایک نئی دنیا سے تعارف حاصل ہو رہا ہے۔ فیضؔ نے یہ بھی لکھا ہے کہ تنہائی اور اسیری کے تجربے میں انسانی حسیات کچھ زیادہ تیز ہو جاتی ہیں اور ہر شے اپنی اصلیت سے کچھ زیادہ نظر آنے لگتی ہے چنانچہ تقریباً دو سال کی مدت میں فیضؔ کا حیاتی یا زندانی کلام اتنا جمع ہو گیا کہ اسے کتابی شکل میں شائع کیا جائے۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۵۲ء کے تیسرے ہفتے میں 'دستِ صبا' کے نام سے یہ مجموعہ پیپلز پبلشنگ ہاؤس کے زیرِ اہتمام عبدالرؤف ملک نے شائع کیا۔ اس کا سرورق عبدالرحمٰن چغتائی نے بنایا تھا اور اس مجموعے کی بے پناہ پذیرائی ہوئی کیونکہ یہ وہ دور تھا۔ فیضؔ اور ان کے تمام ساتھیوں سے اکثریت ہمدردی کا جذبہ رکھتی تھی اور فیضؔ کا لکھا ہوا ایک مصرعہ بھی کہیں شائع ہو جاتا تو لوگ اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے اور جذب و شوق سے پڑھتے۔ 'دستِ صبا' یقیناً 'نقشِ فریادی' سے مختلف فضا اور

اسلوب کا حامل ہے لیکن 'نقشِ فریادی' کی آخری چار نظمیں ایسی تھیں کہ جنہیں 'دستِ صبا' کے اسلوب کے مطابقت کا حامل کہا جاسکتا تھا۔ چنانچہ فیضؔ نے 'دستِ صبا' میں یہ چار نظمیں ابتدا ہی میں شامل کرلیں۔ 'اے دلِ بے تاب ٹھہر'، 'کبھی کبھی یاد میں ابھرتے ہیں......'، 'سیاسی لیڈر کے نام'، 'مرے ہمدم مرے دوست'......

یہ پس منظر فیضؔ کے کئی حوالوں میں موجود ہے لیکن تازہ ترین حوالہ خود عبدالرؤف ملک کی کتاب 'فیضؔ شناسی' ہے جس میں انہوں نے فیضؔ کے کلام کی فراہمی اور 'دستِ صبا' کی اشاعت کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے اور ساتھ ہی یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ اس کی تعارفی تقریب ۲۲ دسمبر ۱۹۵۲ء کو لاہور کے ارجنٹینا ہوٹل میں منعقد ہوئی۔ عبدالرحمٰن چغتائی نے صدارت کی اور اس میں ایلس فیض بھی موجود تھیں۔ فیضؔ کو اس تقریب کا علم تھا۔ انہوں نے حسبِ عادت اس تقریب کو غیر ضروری قرار دیا لیکن یہ بھی کہا کہ اگر اس سے کوئی بہتری کی صورت نکلتی ہے تو پھر ادب اور انسانی فلاح و بہبود کے تناظر میں اسے پیش کیا جائے۔ ملک صاحب نے لکھا ہے کہ اس وقت تک تقریب رونمائی یا انگریزی میں Book launching جیسی کوئی اصطلاح سننے میں بھی نہیں آئی تھی۔ ایلس فیض بھی اس طرح کی اجرائی تقریبات سے ناواقف تھیں۔ عبدالرؤف ملک کے اس اظہار کے بعد وہ تمام دعوے غلط ہوجاتے ہیں جو بعد میں بعض شاعروں اور ادیبوں نے اپنے ساتھ ایسی تقاریب کی اوّلیت کا سہرا باندھنے کے لیے کیے۔

یہ تو 'دستِ صبا' کا ایک سماجی رخ ہے جسے فیضؔ کے مطالعے میں شامل کرنے سے فیض فہمی کے مزید گوشے اجاگر ہوسکتے ہیں۔

ابتدا میں ہم نے فیضؔ کی شاعری اور ان کی فکر کو ایک خاص فضا کے حوالے سے بیان کیا لیکن حسیاتی دور میں جو کلام فیضؔ نے تخلیق کیا وہ موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے بہت مختلف ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ 'نقشِ فریادی' فیضؔ کے آسمان کا ماہتاب تھا تو 'دستِ صبا' کو آفتاب قرار دینا چاہیے۔ 'دستِ صبا' جس قطعے سے شروع ہوتی ہے وہ ضرب المثل بن چکا ہے۔

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے

ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

اس طرح فیض کی زندانی شاعری کے لیے کہا جا سکتا ہے کہ ان کے دل کی دھڑکن شاعری کا آہنگ اور زنجیر کی جھنکار جب ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے تو یہ شاعری معرضِ تخلیق میں آئی۔

فیض نے 'دستِ صبا' کے دیباچے میں بعض بنیادی باتیں ایسی کہی ہیں کہ جن سے ان کے نظریے کی پوری وضاحت ہو جاتی ہے۔ انہوں نے غالبؔ کے اس شعر کو استعارے کے طور پر اخذ کیا ہے۔

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جز میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

اس سے فیض نے اپنے مخصوص استعاراتی انداز میں یوں واضح کیا ہے کہ یقیناً شاعر کا کام قطرے میں دجلہ دکھانا ہے لیکن یہ عمل تو صرف مشاہدہ ہے اصل میں تو زندگی کا تغیر اور انقلاب مجاہدے سے عمل میں آتا ہے۔ فیض کے الفاظ یہ ہیں:

'یوں کہیے کہ شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے۔'

اس استعارے سے گریز کر کے فیض آگے لکھتے ہیں:

'مجھے کہنا صرف یہ تھا کہ حیاتِ انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک اور اس جدوجہد میں حسبِ توفیق شرکت، زندگی کا تقاضا ہی نہیں فن کا بھی تقاضا ہے۔ فن اسی زندگی کا ایک جز اور فنی جدوجہد اسی جدوجہد کا ایک پہلو ہے۔ یہ تقاضا ہمیشہ قائم رہتا ہے اسی لیے طالب فن کے مجاہدے کا کوئی نروان نہیں اس کا فن ایک دائمی کوشش ہے اور مستقل کاوش اس کوشش میں کامرانی یا ناکامی تو اپنی اپنی توفیق و استعداد پر ہے لیکن کوشش میں مصروف رہنا بہر طور ممکن بھی ہے اور لازم بھی۔'

'دستِ صبا' کا یہ دیباچہ فیض نے ۱۶ ستمبر ۱۹۵۱ء کو سینٹرل جیل حیدرآباد میں تحریر کیا تھا اس دیباچے کے آئینے میں ہم فیض کی فکر اور زندگی کو آخری لمحے تک بھی دیکھ سکتے ہیں کیونکہ فیض نے کبھی نروان اور صلے کی تمنا میں تخلیق شعر کا منصب انجام نہیں دیا۔ ان کے نزدیک کامرانی اور ناکامی کی اتنی اہمیت نہیں جتنی سلامت فکر اور انسانی جدوجہد کی ہے۔

'دستِ صبا' میں فیض کی شاعرانہ خوبیاں ان کے پہلے مجموعے سے بہت بہتر اور نمایاں ہیں۔ اس میں انہوں نے اردو، فارسی اور عربی کی کلاسیکی شاعری کے علاوہ مغربی شاعری کی بہترین روایات سے بھی استفادہ کیا ہے۔ نئے استعارات، نئی تمثیلات اس طرح تخلیق کی ہیں کہ اس کی دوسری مثال ان کے معاصرین میں کسی اور کے ہاں نہیں ملتی۔ اس نظم جس کا عنوان ہے 'زنداں کی ایک صبح'، کتنی ندرت، انفرادیت اور صناعی کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔

رات باقی تھی ابھی جب سر بالیں آ کر
چاند نے مجھ سے کہا جاگ سحر آئی ہے
جاگ اس شب جو مئے خواب ترا حصہ تھی
جام کے لب سے تہہ جام اتر آئی ہے
عکس جاناں کو وداع کر کے اٹھی میری نظر
شب کے ٹھہرے ہوئے پانی کی سیہ چادر پر
جا بجا رقص میں آنے لگے چاندی کے بھنور
چاند کے ہاتھ سے تاروں کے کنول گر گر کر
ڈوبتے تیرتے مرجھاتے رہے کھلتے رہے
رات اور صبح بہت دیر گلے ملتے رہے

یہ 'دستِ صبا' ہی کی شاعری ہے جس میں فیض نے 'وطن' اور 'محبوب' کو فکری اور جذباتی سطح پر یکساں اہمیت دی ہے۔ ان کا یہ مصرعہ اس کی بھرپور دلالت کرتا ہے۔

چاہا ہے اسی غم میں لیلائے وطن کو

اسی مجموعے میں فیض کا وطن پرستی کا جذبہ بھی پوری طرح نمایاں ہوا ہے کیونکہ جب تک سازش کیس کا فیصلہ فیض اور ان کے رفقا کے حق میں نہیں ٹھہرا اس وقت تک تو انہیں 'غدار' اور 'وطن دشمن' ہی سمجھا جاتا رہا لیکن فیض کی زندانی شاعری سے ایسے تمام الزامات کی بھرپور نفی ہو جاتی ہے۔ خاص طور پر ان کی یہ نظم۔

نثار میں تیری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے

جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے جسم و جاں بچا کے چلے
ہے اہلِ دل کے لیے اب یہ نظم بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد

نظم کا اختتام اس طرح ہوتا ہے۔

گر آج اوج پہ ہے طالع رقیب تو کیا
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں
جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاج گردش لیل و نہار رکھتے ہیں

'دستِ صبا' ہی میں فیضؔ کی یہ نظمیں جن کے عنوانات یہ ہیں 'شورش بربط و نے'، 'ترانہ'، 'دو عشق'، 'ایرانی طلبا کے نام'، 'یاد' غیر معمولی تخلیقی جمالیات سے متصف ہیں۔ 'یاد' کے یہ اشعار اردو شاعری میں غیر معمولی اضافہ ہیں اور اس میں انگریزی شاعری کی ایک سند Transferred Epithet کا استعمال بہت خوبی سے کیا ہے۔ اس میں محسوسات کو ایک دوسرے میں منتقل کرنے کی بہترین مثالیں ملتی ہیں۔ تجرید سے تجسیم اور تجسیم سے تجرید کی ہنرمندی اس میں نظر آتی ہے۔

دشتِ تنہائی میں اے جانِ جہاں لرزاں ہیں
تیری آوازِ کے سائے تیرے ہونٹوں کے سراب
دشتِ تنہائی میں دوری کے خس و خاک تلے
کھل رہے ہیں تیرے پہلو کے سمن اور گلاب

شاعرانہ وصف کے ساتھ ساتھ فیضؔ کی اس غیر معمولی خوبی کا بھی اس میں عکس ملتا ہے جسے میں نے اپنے ایک مضمون میں 'نشاطِ ہجر' کا نام دیا ہے۔ اسی مجموعے میں فیضؔ کی حوصلہ مندی اور اپنے آدرش سے ہمہ وقت جڑے رہنے کی غیر معمولی صداقت نظر آتی ہے۔

فیضؔ نے اگرچہ 'دستِ صبا' میں ایسا کلام پیش کیا ہے جو فنی لحاظ سے بھی خاص اہمیت رکھتا ہے لیکن شاید انہیں یہ احساس تھا کہ اسے اور بھی بہتر بنایا جا سکتا تھا چنانچہ اپنے ایک خط میں چراغ حسن حسرت کو لکھتے ہیں کہ 'میرا دوسرا شعری مجموعہ شائع ہونے والا ہے۔ میں اس وقت زنداں کے

تجربے سے گذر رہا ہوں اگر آپ اس کلام کو دیکھ لیتے تو اچھا تھا۔' یہ طرزِ احساس فیضؔ صاحب کی عام زندگی میں بھی نظر آیا۔ چراغ حسن حسرت کے مکتوب * سے ظاہر ہوتا ہے کہ فیضؔ ادب وشعر کے رموز پر ان سے خط وکتابت کرتے تھے۔ 'دستِ صبا' کی ایک نظم 'ایرانی طلبا کے نام' بھی اپنے ڈکشن کے اعتبار سے بہت مختلف ہے۔

یہ کون سخی ہیں
جن کے لہو کی
اشرفیاں چھن چھن، چھن چھن،
دھرتی کے پیہم پیاسے
کشکول میں ڈھلتی جاتی ہیں
کشکول کو بھرتی جاتی ہیں

اس سانحے میں امریکہ کا اشارہ بھی شامل تھا۔ اس اعتبار سے بقول عزیز حامد مدنی، ڈالر کے غلبے کے دور میں لہو کی اشرفیاں کہنا غیر معمولی شاعرانہ اظہار ہے۔ اسی نظم میں فیضؔ نے 'آنکھوں کے نیلم مرجان'، 'ہاتھوں کی بیکل چاندی'، 'میٹھے بول' اور 'کڑوی آگ' جیسی خوب صورت تراکیب استعمال کی ہیں لیکن اس طرح کہ تراکیب کی خوب صورتی میں جذبے کی شدت اور مقصد کی حدت کم نہیں ہونے پائی۔ اختتامی مصرعے میں طنز پوری طرح نمایاں ہے۔

جو دیکھنا چاہے پردیسی
پاس آئے دیکھے جی بھر کر
یہ زیست کی رانی کا جھومر
یہ امن کی دیوی کا کنگن

'دستِ صبا' کی یہ نظمیں یقیناً اس سے پہلے کی نظم نگاری کو خیرباد کہہ کر اس نئی فضا میں قدم رکھتی ہیں اور 'دستِ صبا' ہی کی شاعری نے فیضؔ کو ایک جدید کلاسیک (Modern classic) کا درجہ

---

* مولانا چراغ حسن حسرت کے خط اور خود فیضؔ صاحب کے اُس خط کے لیے جس کے جواب میں حسرت نے انہیں یہ خط لکھا، ملاحظہ کیجیے ضمیمہ نمبر ۵ اور نمبر ۶

ان کی زندگی میں عطا کر دیا۔

نظموں کے علاوہ 'دستِ صبا' کی غزلوں کو بھی غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ فیضؔ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے کلاسیکی استعاروں مثلاً نقش صیاد، گل، بہار، خزاں، زنجیر رقص زنداں، شیخ محتسب، وکیل منصف، روزِ حشر، صبح، رات، چاند اور ایسی ہی دیگر علامات و تمثیلات سے انہوں نے جدید جدید طرزِ احساس کو اجاگر کیا ہے۔ شاعری کی مانوس لفظیات میں نئے معنی پیدا کر کے ہی فیضؔ نے اس دعوے کو درست ثابت کیا ہے۔

هم نے جو طرز فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیضؔ گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

فیضؔ کی غزلوں اور نظموں سے جو 'دستِ صبا' میں شامل ہیں متعدد کتابوں، افسانوں اور ناولوں کے عنوانات رکھے گئے ہیں جیسے 'عمر گذشتہ کی کتاب'، 'سفینۂ غم دل'، 'پھر نظر میں پھول مہکے'، 'غم دل کا نصیبہ'، 'دلدار نظر کی شبنم'، 'شیشوں کا سجا' وغیرہ۔ فیضؔ نے غزل میں بعض بالکل نئے طرزِ احساس کو جگہ جگہ نمایاں کیا ہے۔ ذیل کے اشعار روایتی نہیں۔

گلوئے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے
تو لوٹ آئے تیرے سربلند کیا کرتے
یہی کنار فلک کا سیہ ترین گوشہ
یہی ہے مطلعِ ماہ تمام کہتے ہیں
ہم سے کہتے ہیں چمن والے، غریبانِ چمن!
تم کوئی اچھا سا رکھ لو اپنے ویرانے کا نام
بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم
غم جہاں ہو غم یار ہو کہ تیرِ ستم
جو آئے آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں
ان کی نظر میں کیا کریں پھیکا ہے اب بھی رنگ
جتنا لہو تھا صرف قبا کر چکے ہیں ہم

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

بقول عبدالرؤف ملک 'دستِ صبا' کے پہلے ایڈیشن میں یہ شعر اس لیے شامل نہیں کیا گیا کہ اس سے توہینِ عدالت کا پہلو نکلتا تھا۔ ایک شعر کیا بقول فیضؔ ؎

وہی وکیل بھی ٹھہرے اور ہیں منصف بھی
کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں

لیکن وقت اور زمانے کی صداقتوں نے ثابت کر دیا کہ فیضؔ اپنے وطن، اپنے عوام، امن کی خواہش اور انسان دوستی کے سائبان تلے زندہ رہے اور آخر وقت تک اپنے نظریے اور نصب العین سے وابستہ رہے۔ اسی لیے ان کی صد سالہ جشن کی تقریبات دنیا کے جتنے ملکوں اور شہروں میں منائی جا رہی ہیں، اس طرح کی کوئی مثال اس سے پہلے اردو کے کسی شاعر کے حصے میں نہیں آئی۔ یہ اسی مسلک اور فنی ریاضت کا حاصل ہے جسے فیضؔ نے مشاہدے کے ساتھ ساتھ مجاہدے کی ضرورت سے تعبیر کیا ہے۔

'زنداں نامہ'۔ایک جائزہ

فیضؔ کی شاعری کا آغاز اس وقت کی عام فضا اور روایت کے مطابق نوجوانوں کے جذبات و محسوسات جسے اِک نوع کی رومانیت کا نام بھی دیا جاسکتا ہے، شروع ہوئی تھی، لیکن ان کی تخلیقی ذہانت محض ادبی اسالیب تک محدود نہیں رہی بلکہ اس وقت کے برصغیر کی سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی آشوب ناکی سے متاثر ہوکر اور عالمی سطح پر ہونے والی پہلی جنگِ عظیم کے بعد فیضؔ ایک نظریاتی شاعر بھی ہوگئے۔

ان کا نظریہ علامہ اقبالؔ کی طرح عام انسانوں کی فلاح و بہبود اور انسان کے بہتر مستقبل پر مبنی تھا۔ جسے اشتراکی تحریکوں نے عالمی شکل دے دی اور ہمارے ادیب اور دانشور بھی اس سے متاثر ہوئے۔ علامہ اقبال نے روس کے ۱۹۱۷ء کے انقلاب کا اس طرح خیر مقدم کیا تھا۔

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

اسی طرح اقبالؔ کی 'خضرِ راہ'، 'طلوعِ اسلام'، 'ساقی نامہ' اور 'اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو' نیز 'لینن خدا کے حضور میں'، 'کارل مارکس' اور 'ابلیس کی مجلسِ شوریٰ' جیسی نظمیں اپنی اثر انگیزی کی بنا پر آج تک رہنمائی کا سبب بن رہی ہیں۔ فیض احمد فیضؔ کا اقبال سے جو قدرتی تعلق پیدا ہوگیا اس میں سیالکوٹ اور وہاں کے تعلیمی ادارے اور عملی شخصیات اور خود علامہ کا کلام یقیناً فیضؔ کے ذہنی سانچے کی ساخت میں ضرور اثر انداز ہوئے ہوں گے اور فیض نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ سامراج کے خلاف جنگ اور اعلیٰ اقدار کی تشکیل و تعمیر اقبال کا بھی مطمحِ نظر تھا، لیکن اس وقت

برطانوی راج اور غلامی کے جبر و استبداد کے باوجود اقبال گرفتار نہیں ہوئے اور کبھی قید و بند کی صعوبتوں سے نہیں گذرے۔ لیکن اپنے ہی نئے ملک اور آزادی کے ثمرات سے آگاہ ہونے والی سرزمین میں فیضؔ کو اپنے نظریات کی پاداش میں اسیری کے شب و روز بسر کرنے پڑے۔

فیضؔ کے حیاتی کلام کا ایک حصہ 'دستِ صبا' پر مشتمل ہے اور 'زنداں نامہ' کو بھی اسی کا تسلسل کہنا چاہیے لیکن جس طرح عام انسانی معاشرے میں کوئی کیفیت مسلسل اور ہمہ وقت جاری و ساری نہیں رہتی، اسی طرح اسیری کی زندگی بھی کسی ایک نہج پر قائم نہیں رہتی اس کا اندازہ 'دستِ صبا' اور 'زنداں نامہ' کے مطالعے سے ہو جاتا ہے۔ فیضؔ کی اسیری کی تاریخ ۹ مارچ ۱۹۵۱ء ہے وہ اپریل ۱۹۵۵ء میں رہا ہوئے اس طرح یہ قید و بند کا زمانہ چار سال سے کچھ زائد مدت پر محیط ہے۔ جب تک فیضؔ اور ان کے دوسرے ساتھیوں مثلاً سجاد ظہیر، میجر محمد اسحاق، ظفر اللہ پوشنی وغیرہ کو ایک جگہ رکھا گیا، تو یہ دور سبھی نے خوش دلی سے بسر کیا لیکن جیسا کہ سجاد ظہیر، میجر اسحٰق اور ظفر اللہ پوشنی نے بھی لکھا ہے کہ پھر ان اسیرانِ قفس کو الگ الگ شہر کے زندانوں میں بھیج دیا گیا۔ اس وقت فیضؔ کے جو حالات رہے ان کا کچھ اندازہ میجر اسحاق کی اس تحریر سے ہوسکتا ہے کہ ان کی زنداں نامے کی شاعری میں وہ جوش و خروش نہیں ملتا جو 'دستِ صبا' کی شروع کی نظموں میں ہے۔ اس کا سبب وہ یہ بتاتے ہیں کہ ایک تو مقدمے کی سماعت کے بعد تذبذب کا عالم طاری ہو گیا پھر اسی دوران فیضؔ صاحب کے بھائی کی اندوہناک موت واقع ہوگئی اور فیضؔ اس سے بے انتہا ملول اور نڈھال رہے۔ ظاہر ہے کہ نظریے کی قوت تو اپنی جگہ ہوتی ہی ہے لیکن زمینی حقائق اور معروضی حالات پر تخلیقی ذہن کو بدلتے ہوئے ماحول کے مطابق سوچنے اور لکھنے کے زاویے فراہم کرتے ہیں۔

'زنداں نامہ' فیضؔ کے دیگر مجموعوں کی طرح نظموں، غزلوں اور قطعات پر مشتمل ہے، اس زمانے کی شاعری کو آثرؔ لکھنوی جیسے استاد نے ان لفظوں میں سراہا ہے:

> 'فیض احمد فیضؔ کی شاعری ترقی کے مدارج طے کر کے اب اس نقطۂ عروج پر ہے۔ جس تک شاید ہی کسی دوسرے ترقی پسند شاعر کی رسائی ہوئی ہو'۔

اس طرح کے جو اعترافات کبھی آثرؔ لکھنوی اور کبھی فراقؔ گورکھپوری کی جانب سے آئے، اندازہ ہوتا ہے کہ فیضؔ نے واقعی اپنی شاعری سے اپنے سینئر اور ہم عمر اور بعد کے آنے والوں کو گہرے طور پر متاثر کیا۔ اسی زنداں نامے میں 'ملاقات' جیسی نظم شامل ہے اس کے لیے فراقؔ

گورکھپوری نے ایک جگہ لکھا ہے کہ کاش ایسی نظم میں لکھ سکتا۔ 'ملاقات' خود جیل کی ایک اصطلاح ہے کہ جب کوئی ملنے والا آتا ہے تو قیدی سے کہا جاتا ہے 'تمہاری ملاقات آئی ہے۔'

فیضؔ نے اپنی بے مثال رجائیت کو زنداں نامے کی شاعری میں بھی برقرار رکھا ہے حالانکہ اس دوران میں مقامات، جیلوں کی تبدیلی اور ان کی علالت ان کی شاعرانہ کیفیات پر اثر انداز ہو سکتی تھیں لیکن شاعری کی وہ جمالیات جو فیضؔ کا خاصہ ہیں 'زنداں نامے' میں بھی جگہ جگہ دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتی ہیں بطورِ خاص یہ اشعار۔

شمع نظر خیال کے انجم جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں

ہم اپنے راز پہ نازاں تھے شرمسار نہ تھے
ہر ایک سے سخن رازدار کرتے رہے
ان ہی کے فیض سے بازار عقل روشن ہے
جو گاہ گاہ جنوں اختیار کرتے رہے

فیضؔ نے یہ غزل جناح اسپتال میں کہی تھی۔ اسی علالت کے زمانے میں جولائی ۱۹۵۳ء میں یہ غزل کہی جو اپنی لطافت، غنائیت اور لفظی جمالیات کے اعتبار سے فیضؔ کی چند خوب صورت نظموں میں شامل ہے۔

شامِ فراق اب نہ پوچھ آئی اور آکے ٹل گئی
دل تھا کہ پھر بہل گیا، جاں تھی کہ پھر سنبھل گئی
دل سے تو ہر معاملہ کرکے چلے تھے صاف ہم
کہنے میں ان کے سامنے بات بدل بدل گئی
آخر شب کے ہم سفر فیضؔ نہ جانے کیا ہوئے
رہ گئی کس جگہ صبا، صبح کدھر نکل گئی

پھر یہ غزل بھی فیض کی طرزِ ادا کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے۔

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں کب ہات میں تیرا ہات نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں

مشکل ہیں اگر حالات، ہاں، دل بیچ آئیں جاں دے آئیں
دل والو کوچۂ جاناں میں کیا ایسے بھی حالات نہیں
میدانِ وفا دربار نہیں یاں نام و نسب کی پوچھ کہاں
عاشق تو کسی کا نام نہیں، کچھ عشق کسی کی ذات نہیں
یہ بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگادو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

فیضؔ نے لاہور جیل میں ایک نظم کا آغاز کیا جو منٹگمری جیل میں مکمل ہوئی۔ اس کا عنوان ہے 'اے روشنیوں کے شہر' یہ نظم اپنی ہیئت تواضی اور تاثر کے اعتبار سے بہت منفرد ہے۔ اسی زنداں نامے میں فیضؔ کی ایک اور غزل بہت مشہور ہوئی، اس میں بھی فیضؔ نے غزل کی رمزیت اور کلاسیکی کنایوں سے کام لیا ہے اور اپنی بات تہہ در تہہ گہرائی کے ساتھ بیان کردی ہے۔

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے
قفس اداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہر خدا آج ذکر یار چلے
بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل غریب سہی
تمہارے نام پہ آئیں گے غمگسار چلے
جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے
مقام، فیضؔ کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

'زنداں نامہ' اگرچہ نسبتاً مختصر مجموعۂ کلام ہے لیکن اس مجموعے میں فیضؔ کی بعض عہد ساز نظمیں بھی شامل ہیں۔ مثلاً 'ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے'۔ یہ نظم امریکہ کے سائنسدان جوڑے ایتھل اور جولیس روزنبرگ کے بارے میں ہے جنہیں اس وقت کی امریکی حکومت نے ایٹمی راز روس تک پہنچانے کے جرم میں سزائے موت دی تھی۔ فیضؔ کی بعض نظمیں جن میں یہ نظم بھی شامل

ہے، اگرچہ کسی ایک شخصیت، ایک واقعے یا ایک لمحاتی تجربے پر مبنی ہوتی ہیں، لیکن اس میں ایسی گہرائی، وسعت اور آفاقیت پائی جاتی ہے کہ ان کے کلام کا اطلاق ان واقعات و شخصیات پر بھی ہو جاتا ہے جن کا براہِ راست تعلق ان اشعار سے نہ بھی رہا ہو۔ آج بھی جب کسی بڑے مقصد کے لیے جاں نثاری کی منزلیں طے کی جاتی ہیں اور ریاستی جبر زیادہ سنگین ہو جاتا ہے۔ فیضؔ کی ایسی ہی نظموں کے مصرعے یاد آتے ہیں۔

نارسائی اگر اپنی تقدیر تھی
تیری الفت تو اپنی ہی تدبیر تھی
کس کو شکوہ ہے گر شوق کے سلسلے
ہجر کی قتل گاہوں سے سب جا ملے

....

قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے
جن کی راہ طلب سے ہمارے قدم
مختصر کر چلے درد کے فاصلے
کر چلے جن کی خاطر جہاں گیر ہم
جاں گنوا کر تری دلبری کا بھرم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

فیضؔ نے صرف یہی نہیں کہ کلاسیکی سجاوٹ اور رچاؤ کو اپنے کلام کا جز و لازم بنا لیا اور اس میں جدید موضوعات اور نئے علامتی رخ سمو دیئے بلکہ بعض قدیم اصناف سخن کو بھی نئے معنی اور نئے تناظر میں پیش کیا۔ واسوخت ہماری کلاسیکی شاعری کی ایک صنف ہے جس میں عاشق اپنے محبوب سے کبھی طنز، کبھی شکوے اور کبھی طعن و تشنیع سے مخاطب کرتا ہے۔ فیضؔ نے اسے ایک سیاسی اور نظریاتی رخ دیا ہے اور اس طرح ایک سیاسی واسوخت کا اضافہ اردو ادب میں کر دیا۔

سچ ہے ہمیں کو آپ کے شکوے بجا نہ تھے
بے شک ستم جناب کے سب دوستانہ تھے

ہاں، جو جفا بھی آپ نے کی، قاعدے سے کی!
ہاں، ہم ہی کاربند اصولِ وفا نہ تھے
آئے تو یوں کہ جیسے ہمیشہ تھے مہرباں
بھولے تو یوں کہ گویا کبھی آشنا نہ تھے

فیضؔ کا عمومی اندازِ سخن یہ نہیں ہے اور اس کا احساس واسوخت کے آخری شعر سے فیضؔ نے خود ہی ظاہر کر دیا ہے۔

لب پر ہے تلخیٔ مۓ ایام، ورنہ فیضؔ
ہم تلخیٔ کلام پہ مائل ذرا نہ تھے

'زنداں نامے' کی بیشتر شاعری فیضؔ کے ذاتی محسوسات کا ایک اثر انگیز مرقع تو ہے ہی لیکن اس میں خیر و شر اور حق و باطل کی جنگ کے متعلق ایک ایسا آدرش بھی ملتا ہے جو وقت اور جغرافیہ کی حدود سے ماورا ہو کر ایک غیر منقسم دائرۂ عمل میں شامل ہو جاتا ہے۔ ایسی ہی ایک نظم 'درد آئے گا دبے پاؤں' ہے۔ اس میں دل سے بھی تخاطب ہے اور یہ ایک طرح کی خود کلامی ہے یعنی۔

دل سے پھر ہو گی مرے بات کہ اے دل اے دل

یہ جو محبوب بنا ہے تری تنہائی کا
یہ تو مہماں ہے گھڑی بھر کا، چلا جائے گا
اس سے کب تیری مصیبت کا مداوا ہوگا
مشتعل ہو کے ابھی اٹھیں گے وحشی سائے
یہ چلا جائے گا، رہ جائیں گے باقی سائے
رات بھر جن سے ترا خون خرابہ ہوگا
جنگ ٹھہری ہے کوئی کھیل نہیں ہے اے دل
دشمنِ جاں ہیں سبھی، سارے کے سارے قاتل
یہ کڑی رات بھی ہے، یہ سائے بھی، تنہائی بھی
درد اور جنگ میں کچھ میل نہیں ہے اے دل

قیدِ تنہائی میں جس طرح امید و بیم کے سائے ابھرتے اور مٹتے ہیں، کبھی مایوسی اپنی گرفت میں لینا

چاہتی ہے اور کبھی ایک شعلۂ عمل بھڑک کر اپنے وجود کی سمت نمایاں کر لیتا ہے۔ فیض کی اسی نظم میں یہ مصرعے بھی ہیں۔

لاؤ سلگاؤ کوئی جوش غضب کا انگار
طیش کی آتش جرار کہاں ہے لاؤ
وہ دہکتا ہوا گلزار کہاں ہے لاؤ

ان مصرعوں سے قازقستان کے بزرگ تاتاری شاعر، جبول جابر کی وہ نظم یاد آتی ہے جس کا ترجمہ مخدوم محی الدین نے یوں کیا ہے۔

قرۃ العین! مری جانِ عزیز
اور مرے فرزندو!
برق پا و مرار ہوار کہاں ہے لانا
تشنۂ خوں مری تلوار کہاں ہے لانا
میرے نغمے تو وہاں گونجیں گے

فیض کی اس نظم میں درد کے رشتے کا یہ کام پوری قوت کے ساتھ ظاہر ہوا ہے اور اس کا اختتام یوں ہوا ہے۔

ہو نہ ہو اپنے قبیلے کا بھی کوئی لشکر
منتظر ہوگا اندھیرے کی فصیلوں کے اُدھر

....

ان کو شعلوں کے رجز اپنا پتا تو دیں گے
خیر، ہم تک وہ نہ پہنچیں بھی، صدا تو دیں گے
دور کتنی ہے ابھی صبح، بتا تو دیں گے

اس نظم میں فیض نے اگرچہ دبے پاؤں کی رمزیت سے آغازِ کلام کیا ہے لیکن درد اور جنگ کی الگ الگ کیفیات کو ظاہر کرتے ہوئے جب بظاہر درد کی کیفیت سے دست کش ہوتے ہیں تو جنگ کی منطق ایسی لفظیات کی طرف کلام کا رخ پھیر دیتی ہے جو شدت اور عمل کی قوت کو متشکل کر دیتے ہیں۔ مثلاً 'لاؤ سلگاؤ'، 'غضب کا انگار'، 'طیش کی آتشِ جرار'، 'شعلوں کے رجز' اس لحاظ سے فیض کی

یہ نظم دل اور درد، درد اور جنگ جیسی کیفیات پر ایک غیر معمولی تخلیق کی حیثیت رکھتی ہے۔

فیضؔ نے شاعری مطالعے، مشاہدے اور تجربے سے بہت کچھ اپنے کلام کو نئی جہات سے روشناس کیا ہے لیکن خود جیل کے ماحول میں نظر آنے والی اشیا اور واقعات کو بھی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ ان ہی میں ایک نظم 'دریچہ' ہے جس کا آغاز یوں ہوتا ہے

گڑی ہیں کتنی صلیبیں مرے دریچے میں
ہر ایک اپنے مسیحا کے خوں کا رنگ لیے
ہر ایک وصلِ خداوند کی اُمنگ لیے
کسی پہ کرتے ہیں ابرِ بہار کو قرباں
کسی پہ قتلِ مہِ تابناک کرتے ہیں
کسی پر ہوتی ہے سرمست شاخسار دونیم
کسی پہ بادِ صبا کو ہلاک کرتے ہیں

....

ہر آئے دن یہ خداوندگانِ مہر و جمال
لہو میں غرق مرے غم کدے میں آتے ہیں
ہر آئے دن مری نظروں کے سامنے ان کے
شہید جسم سلامت اٹھائے جاتے ہیں

فیضؔ کی یہ نظم اگرچہ زنداں میں موت کی سزا پانے والوں کے بارے میں ہے لیکن کوئی صریح اشارہ کیے بغیر اس کا وہ مسیحی تصور ہے جو حضرت عیسیٰ کو صلیب دینے کے سلسلے میں ایک عقیدے کے طور پر مسیحی کتب میں موجود ہے۔ کیونکہ 'شہید جسم سلامت اٹھائے جاتے ہیں' اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔ فیضؔ نے آدرش کی خاطر نذرِ صلیب ہونے والوں کو نہایت لطیف استعاروں کے ذریعے بڑے پیارے لہجے میں یاد کیا ہے۔ جیسے 'ابرِ بہار'، 'مہ تاب ناک'، 'سرمست شاخسار' اور 'بادِ صبا' اس میں فیضؔ کی تخلیقی لفظیات اپنے پورے سیاق کے ساتھ موجود ہے اور کہیں بھی ان کے پردے میں اصل موضوع چھپنے نہیں پایا۔ جیل کا ہی ایک اور تجربہ یہ ہے کہ کچھ عقیدت مند تحفے تحائف بھی لے کر آتے ہیں۔ فیضؔ نے ایک نظم پر یہ عبارت درج کی ہے:

'ایک اجنبی خاتون کے نام خوشبو کا تحفہ
وصول ہونے پر'

نظم کا عنوان ہے 'اے حبیبِ عنبر دست' ایک انجانے چہرے سے غائبانہ شناسائی کا یہ رخ ایک عجیب دل نواز اور دلخراش تجربہ ہے پھر بھی وہ عزم قائم ہے کہ قفس پہ ظلم پرست لاکھ پہرے بٹھائیں لیکن بوئے رفاقت کو قید خانے میں آنے سے روک نہیں سکتے۔ آخر میں محبت ہی کو ایک ختم نہ ہونے والے آدرش کے طور پر پیش کیا اور حافظ شیرازی کا یہ شعر نظم کے آخر میں پیش کر دیا۔

خلل پذیر بود ہر بنا کہ مے بینی
بجز بنائے محبت کہ خالی از خلل است

'زنداں نامہ' فیض کے ایسے شب و روز کا ایک دستاویزی مرقع ہے جس میں ان کے مختلف موڈ، کیفیات اور محسوسات نمایاں ہوئے ہیں کہیں وہ تھوڑے بہت پژمردہ ہیں اور کہیں پوری طرح اپنے یقین کی مشعل روشن کیے اندھیروں کو شکست دینے کے بارے میں اظہار کرتے ہیں اور کہیں کہیں ان کے کلام میں ایک نوع کا جوابی حملہ یا defy کرنے کا لہجہ بھی ابھرتا ہے، جیسے یہ غزل۔

دل مدعی کے حرف ملامت سے شاد ہے
اے جانِ جاں یہ حرف ترا نام ہی تو ہے
دل ناامید تو نہیں، ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام، مگر شام ہی تو ہے
دستِ فلک میں گردشِ تقدیر تو نہیں
دستِ فلک میں گردشِ ایام ہی تو ہے

اور اختتام اسی امید پر ہوتا ہے جو فیضؔ کے نظریے کا حاصل ہے۔

آخر تو ایک روز کرے گی نظر وفا
وہ یار خوش خصال سر بام ہی تو ہے

اسی طرح ایک اور غزل میں ان کا لب ولہجہ اس طرح نمایاں ہوا ہے۔

اب کوچۂ دلبر کا رہرو، رہزن بھی بنے تو بات بنے
پہرے سے عدو ٹلتے ہی نہیں اور رات برابر جاتی ہے

ہاں، جاں کے زیاں کی ہم کو بھی تشویش ہے لیکن کیا کیجے
ہر رہ جو ادھر کو جاتی ہے، مقتل سے گزر کر جاتی ہے

'زنداں نامہ' اس کلام پر مشتمل ہے جس میں کوئی فیصلہ کن گھڑی اہلِ زنداں کے لیے وارد نہیں ہوئی تھی۔ اک بے یقینی اور اداسی کی کیفیت تھی، یہاں تک کہ بقول میجر اسحٰق:

'بے بسی نے مزاجوں میں چڑچڑاپن پیدا کر دیا تھا کبھی غضب ناک ہو جاتے تھے، کبھی گریہ وزاری کو جی چاہتا تھا دست و پا تو ناکارہ کر دیئے گئے تھے لیکن دل و جان پر آفت آئی ہوئی تھی۔'

ایسے غیر معمولی تجربے سے گذر کے فیضؔ نے بڑے تخلیقی ذہن کا ایک ایسا روشن مینار نظروں کے سامنے اجاگر کیا ہے کہ بے اختیار ان کی شاعرانہ فنکاری کا انمٹ اثر پیدا ہونے لگتا ہے۔ اس وقت فیضؔ کا کلام اور بھی نادر و کمیاب نظر آنے لگتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بقول فیض:

'کم سے کم جو سزا ہمیں مل سکتی ہے وہ سزائے موت ہے۔'

اس ذہنی کرب، روحانی اذیت کے ساتھ بہار آفرین اور طرب آگیں شعر و سخن کے سرو سمن کھلا دینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اور اس کے لیے لفظیات بھی ایسی وضع کی ہیں جو فیضؔ کی اپنی وضع کردہ ہیں۔ مثالیں 'زنداں نامے' میں جگہ جگہ مل جائیں گی اور ساتھ ہی ان تمام دلوں کو آنے والی ساعتوں سے خبردار رہ کر حوصلہ بھی دلا دیتے ہیں۔

پھر سے بجھ جائیں گی شمعیں جو ہوا تیز چلی
لا کے رکھو سرِ محفل کوئی خورشید اب کے

'دست تہہ سنگ' پر چند معروضات

زمانی اعتبار سے 'دست تہہ سنگ' فیضؔ کا چوتھا مجموعۂ کلام ہے۔ فیضؔ کی تمام شاعری کا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ موسموں اور ماہ و سال کی اپنی تبدیلیاں ناگزیر طور پر زندگی میں شامل رہیں لیکن فیضؔ کا اسلوبِ سخن اور نظریاتی منزل کبھی تبدیل نہیں ہوئی۔ یقیناً واقعات اور ماحول کے دباؤ سے ان کے طرزِ احساس میں تبدیلی ہوتی رہی جو تخلیقی عمل کے تنوع کے لیے ویسے بھی ضروری ہے۔ تاہم وہ جو بات کہی جاتی ہے کہ بڑے ادیب یا شاعر کا تمام تخلیقی کام ایک نوع کی خود نوشت یا آٹو بائیوگرافی بھی ہوتی ہے۔ یہ بات فیض احمد فیضؔ پر پوری طرح صادق آتی ہے ان کی شاعری میں یہ ذاتی حوالے ایک وسیع تر تناظر میں ملتے ہیں لیکن گاہے گاہے انہوں نے خود ہی اپنے بعض تخلیقی دور کی وضاحت بھی کی ہے اور ان تجربات کا بھی ذکر کیا ہے جو ایک خاص وقت میں ان کے تخلیقی عمل کا محرک بنے۔ 'نقشِ فریادی'، 'دستِ صبا' اور 'زنداں نامہ' فیضؔ کی زندگی کا اہم ترین احاطہ کرتے ہیں۔ اور اس میں ان کے تشکیلی اور انقلابی فکر کا اچھا خاصا رنگ ابھر آیا ہے۔ جہاں تک 'دست تہہ سنگ' کا تعلق ہے اس میں بھی فیضؔ نے اپنے اسی اسلوبِ سخن کو برقرار رکھا ہے جو ان کی پہچان ہے۔ 'دستِ صبا' اور 'زنداں نامہ' ایک جبری قید و بند سے عبارت ہے آزاد فضا میں آنے کے بعد فیضؔ کا ذہنی ماحول کیا تھا اس کا اندازہ ان کی اس تحریر سے ہوتا ہے:

> 'زنداں نامہ' کے بعد کا زمانہ کچھ ذہنی افراتفری کا زمانہ ہے: جس میں اپنا اخباری پیشہ چھوٹا، ایک بار پھر جیل خانے گئے، مارشل لاء کا دور آیا اور ذہنی اور گرد و پیش کی فضا میں پھر سے کچھ انسدادِ راہ اور کچھ نئی راہوں کی طلب کا

احساس پیدا ہوا۔ اس سکوت اور انتظار کی آئینہ دار ایک نظم ہے 'شام' اور ایک نامکمل غزل کے چند اشعار۔

کب ٹھہرے گا درد اے دل کب رات بسر ہوگی!'

بحوالہ: 'دست تہہ سنگ'، فیض از فیض، ص ۲۰، (کلیات) نسخہ ہائے وفا، ص ۳۱۴

فیض کا دورِ اسیری جب ختم ہوا تو انہیں بقول ان کے کچھ نئی راہوں کی جستجو ہوئی اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ از سرِ نو اپنے محسوسات اور گرد و پیش کے حالات کا جائزہ لے کر شاعری کے اگلے مرحلے میں داخل ہو رہے ہیں کیونکہ اس بظاہر آزاد فضا کا زمانہ بھی زیادہ طویل نہیں رہا اور ۱۹۵۸ء میں مارشل لاء کا نفاذ تمام موجود خوابوں کی شکست کا سبب بنا لیکن مارشل لاء بھی کسی ملک میں خود بخود نہیں آ جاتا کچھ ایسے سیاسی، معاشی اور معاشرتی عوامل ہوتے ہیں کہ جب عام آدمی فوج کو اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگتا ہے اور اس کی آمد کا خیر مقدم کرتا ہے، لیکن جو اذہان جمہورت اور آزادئ اظہار کو ایمان کا درجہ دے دیتے ہیں ان کے لیے اس طرح کی سوچ ایک سراب سے کم نہیں۔ فیض کا یہ زمانہ ایک نوع کے انتشار اور بے یقینی کا دور تھا۔ فیض تو یقیناً اس کا حصہ نہیں رہے اور نہ ہو سکتے تھے لیکن بائیں بازو کے کئی دانشور پاکستان اور ہندوستان دونوں میں یا تو تذبذب کا شکار ہو گئے یا نظریاتی راہ سے الگ ہو کر زندگی بسر کرنے لگے۔ ایسے ماحول میں نئے اسلوب کی تلاش نے فیض کو غالب کے ایک شعر میں اپنے دعویٰ الفت کی صلابت پیش کرنے کا رخ نظر آیا۔ شعر یہ ہے۔

مجبوری و دعویٰ گرفتاریٔ الفت

دست تہہ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

اب اس شعر کی تشریح تو صرف دست تہہ سنگ ہی نہیں فیض کا پورا کلام ہے لیکن امتثالِ امر کے طور پر یہ کہنا بجا ہوگا کہ اس وقت اپنے نظریے اور نصب العین سے پوری طرح جڑے رہنے کے دو پہلو تھے۔ ایک تو 'مجبوری' کہ بقول غلام احمد قاصر۔

کروں گا کیا جو محبت میں ہو گیا ناکام

مجھے تو اور کوئی کام بھی نہیں آتا

پھر یہ 'مجبوری' فیض کی نظریاتی مجبوری تھی جس میں خارجی زندگی کا کوئی جبر نہ تھا۔ اب دوسرا رخ 'دعویٰ' گرفتاریٔ الفت' اور ظاہر ہے کہ فیض نے اس دعوے کو کبھی نغمۂ سرمد، کبھی سنت منصور اور

کبھی مسلکِ قیس کے ذریعے واضح کیا ہے۔ کہ اگر ظلم و جبر کا نظام ناکام ہو جائے تو ہو جائے عشق کی سربلندی ختم نہیں ہوگی۔ وہ پہلے ہی کہہ چکے ہیں۔

گلوئے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے

تو لوٹ آئے تیرے سربلند کیا کرتے

فیضؔ کی شاعری کو ابتدا سے بعض ناقدین نے غمِ دوراں اور غمِ جاناں میں تقسیم کیا ہے، لیکن فیضؔ کے نزدیک یہ ایک ہی طرزِ احساس کے دو پہلو ہیں جو 'دست تہہ سنگ' میں بھی نمایاں ہیں۔

فیضؔ کا یہ مجموعہ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس وقت تک انہیں بین الاقوامی لینن انعام مل چکا تھا اور اس پُرشکوہ تقریب میں انہوں نے جو تقریر کی تھی وہ بھی اس کتاب میں شامل ہے۔ تقریر زیادہ طویل نہیں لیکن اس میں فیضؔ کے بنیادی افکار جو ان کی شاعری کا محور بھی ہیں، ایک جگہ سمٹ آئے ہیں وہ اس امر پر خاص توجہ دیتے ہیں کہ روزِ ازل سے ہر عہد اور ہر دور میں متضاد عوامل اور قوتیں برسرِ عمل اور برسرِ پیکار رہی ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

'آج کل انسانی مسائل اور گذشتہ دور کی انسانی الجھنوں میں کئی نوعیتوں سے بھی فرق ہے۔ دورِ حاضر میں جنگ سے دو قبیلوں کا باہمی خرابہ مراد نہیں ہے۔ نہ آج کل امن سے خون خرابے کا خاتمہ ممکن ہے۔ آج کل جنگ اور امن کے معنی ہیں امن آدم کی بقا اور فنا ___ بقا اور فنا ان دو الفاظ پر انسانی تاریخ کے خاتمے یا تسلسل کا دارومدار ہے۔'

'نسخہ ہائے وفا'، ص۳۰۴، 'دست تہہ سنگ'، ص۱۰

تاریخ کا حوالہ دے کر فیضؔ نے فنا اور بقا اور انسانیت کی حال اور مستقبل کی کیفیات کو واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے اپنے ملک پاکستان، ہمسایہ ملک ہندوستان اور عرب و افریقہ کے بعض ممالک کے اختلافات کا بھی حوالہ دیا اور خبردار کیا کہ ان اختلافات سے وہی طاقتیں فائدہ اٹھا سکتی ہیں جو امنِ عالم اور انسانی برادری کی دوستی اور یگانگت کو پسند نہیں کرتیں۔ گویا نظریے پر مکمل یقین رکھنا اور ایک بہتر مستقبل کے لیے جدوجہد کرنا ہر صاحبِ ضمیر کا فرض ہے اور تخلیقی فنکار پر تو اس کی زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کیونکہ وہ روشنیٔ طبع کے ساتھ ساتھ اپنے معاشرے کا سب سے حساس فرد ہوتا ہے۔ گویا ایک باضمیر نظریاتی فنکار کے لیے اپنے

نظریے سے وابستگی اور کمٹمنٹ ایسا ہے جیسے کسی بھاری پتھر کے نیچے ہاتھ آ گیا ہو اور اسے کھینچ کر باہر نکالنا ممکن نہ ہو اور ممکن ہو بھی تو وفا کا دعویٰ اسے اس عمل کا کبھی مرتکب نہیں ہونے دے گا۔

فیضؔ نے اس مجموعے کا آغاز اس قطع سے کیا ہے۔

یہ خوں کی مہک ہے کہ لبِ یار کی خوشبو
کس راہ کی جانب سے صبا آتی ہے دیکھو
گلشن میں بہار آئی کہ زنداں ہوا آباد
کس سمت سے نغموں کی صدا آتی ہے دیکھو

یعنی شاعری کا بنیادی رخ وہی ہے کہ خون کی مہک اور لبِ یار کی خوشبو میں کوئی فرق نہیں کیونکہ جس تخلیقی ذہن کا واسطہ ان دونوں حقیقتوں سے ہے وہ ان کے فرق کو خوب پہچانتا ہے۔ جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے کہ وہ زمانہ خود بائیں بازو میں تذبذب اور بے یقینی کا باعث بنا رہا تھا فیضؔ نے اس احساس کو اس طرح نظم کیا ہے۔

بے زار فضا، درپئے آزارِ صبا ہے
یوں ہے کہ ہر اک ہمدمِ دیرینہ خفا ہے
اُمڈی ہے ہر اک سمت سے الزام کی برسات
چھائی ہوئی ہر دانگ ملامت کی گھٹا ہے
وہ چیز بھری ہے کہ سلگتی ہے صراحی
ہر کاسۂ مے زہرِ ہلاہل سے سوا ہے

لیکن جیسا کہ فیضؔ کا مسلک پہلے ہی واضح نظر آتا ہے کہ وہ مشاہدے کے ساتھ ساتھ مجاہدے کو بھی نظریے اور فن کا لازمی حصہ سمجھتے ہیں چنانچہ گردوپیش کی اس بے یقین اور پُرآشوب فضا کا تذکرہ کرنے کے بعد وہ پھر اپنی دیرینہ رجائیت کو یوں لبِ سخن میں ڈھالتے ہیں۔

ہاں جام اٹھاؤ کہ بیادِ لبِ شیریں
یہ زہر تو یاروں نے کئی بار پیا ہے
اس جذبۂ دل کی نہ سزا ہے نہ جزا ہے
مقصودِ رہِ شوق وفا ہے نہ جفا ہے

ہر راہ پہنچتی ہے تری چاہ کے در تک
ہر حرفِ تمنا ترے قدموں کی سزا ہے
زندانِ رہ یار میں پابند ہوئے ہم
زنجیر بکف ہے، نہ کوئی بند بپا ہے

یعنی فیض کی شاعری کسی فرمائش، کسی وقتی ضرورت کے تابع نہیں یہ اپنی وفا کا آپ ہی صلہ ہے یعنی commitment for the sake of commitment ہے۔اور یہی مجبوری و دعویٔ گرفتاریٔ الفت ہے جو فیض کی شخصیت اور فن کا مکمل اشاریہ ہے۔

'دست تہہ سنگ' کومختلف ادوار کی شاعری کا مجموعہ کہہ سکتے ہیں مثلاً اس میں ایک غزل ۳۱ دسمبر ۱۹۵۸ء کی ہے جو لاہور جیل میں لکھی گئی۔ایک اور نظم 'شورشِ زنجیر بسم اللہ' جنوری ۱۹۵۹ء کو لاہور جیل ہی میں لکھی گئی۔اسی طرح 'آج بازار میں پا بجولاں چلو' لاہور جیل ۱۱فروری ۱۹۵۹ء کی یادگار ہے۔اسی طرح ایک غزل جس کا مطلع ہے۔

یہ جفائے غم کا چارہ وہ نجات دل کا عالم
ترا حسن دست عیسیٰ تری یاد روئے مریم
(لاہور جیل فروری ۱۹۵۹ء)

فیض کی اسیری کا سب سے سنگین زمانہ وہ تھا جب انہیں قلعۂ لاہور کے زنداں میں قید کیا گیا۔ یہ زمانہ مارچ ۱۹۵۹ء کا ہے۔اس دور کی یادگار یہ نظم ہے 'قیدِ تنہائی' اور ایک قطعہ جس کا ایک خاص پس منظر بھی ہے اور گویا فیض پر جلبِ منفعت کا الزام لگا کر اہلِ اقتدار کی طرف سے پوچھ گچھ ہوئی تھی جس کا جواب فیض نے یوں دیا۔

ہم خستہ تنوں سے محتسبو کیا مال منال کا پوچھتے ہو
جو عمر سے ہم نے بھر پایا سب سامنے لائے دیتے ہیں
دامن میں ہے مشتِ خاکِ جگر، ساغر میں ہے خونِ حسرتِ مے
لو ہم نے دامن جھاڑ دیا، لو جام الٹائے دیتے ہیں
(قلعۂ لاہور، مارچ ۱۹۵۹ء)

اس بے نیازی اور درویشی کا سبب یہ تھا کہ فیض کبھی مال و منال کے پیچھے وقت ضائع کرنے

کے قائل نہیں رہے وہ زندگی سے خطاب کر کے کہتے ہیں۔

جو ترے حسن کے فقیر ہوئے ان کو تشویشِ روزگار کہاں
درد بیچیں گے گیت گائیں گے اس سے خوش وقت کاروبار کہاں

اور یہ چیلنج بھی اسی بنیاد پر فیض نے یوں پیش کیا۔

کون ایسا غنی ہے جس سے کوئی
نقد شمس و قمر کی بات کرے
جس کو شوقِ نبرد ہو ہم سے
جائے تسخیر کائنات کرے

جیسا کہ کہا جا چکا ہے 'دست تہہ سنگ' میں زمانی تسلسل نہیں ہے اور اسی طرح اس میں شامل کلام کئی دوسرے شہروں میں تخلیق ہوا ہے۔ اس میں پیکنگ، سنکیانگ، جھانگ چاؤ، بمبئی، لندن اور ماسکو شامل ہیں۔ 'دست تہہ سنگ' کئی اعتبار سے ایک غیر معمولی شعری مجموعہ ہے۔ اس میں 'شام' جیسی نظم تو ہے ہی جو ایک خوب صورت امیجری کی عمدہ مثال ہے۔ اس کے علاوہ کیونکہ یہ مارشل لاء کے دور سے بھی تعلق رکھتی ہے اس لیے کبھی تو اداسی کے لمحوں میں فیض نے چند ایسے اشعار تخلیق کیے ہیں۔

جمے گی کیسے بساطِ یاراں کہ شیشہ و جام بجھ گئے ہیں
سجے گی کیسے شبِ نگاراں کہ دل سرِ شام بجھ گئے ہیں
وہ تیرگی ہے رہِ بتاں میں چراغِ رخ ہے نہ شمعِ وعدہ
کرن کوئی آرزو کی لاؤ کہ سب در و بام بجھ گئے ہیں
بہت سنبھالا وفا کا پیماں مگر وہ برسی ہے اب کے برکھا
ہر ایک اقرار مٹ گیا ہے تمام پیغام بجھ گئے ہیں
بہار اب آ کے کیا کرے گی کہ جن سے تھا جشنِ رنگ و نغمہ
وہ گل سرِ شاخ جل گئے ہیں، وہ دل تہہ دام بجھ گئے ہیں

اسی طرح یہ قطعہ بھی اسی کیفیت کی نشاندہی کرتا ہے۔

نہ دید ہے نہ سخن، اب نہ حرف ہے نہ پیام
کوئی بھی حیلۂ تسکیں نہیں اور آس بہت ہے

امید یار، نظر کا مزاج، درد کا رنگ
تم آج کچھ بھی نہ پوچھو کہ دل اداس بہت ہے

اس کا ایک بنیادی سبب تو یہ ہے کہ انصاف کا ترازو ڈانواں ڈول ہے اور عالم یہ ہے کہ ؂

بے دم ہوئے بیمار دوا کیوں نہیں دیتے
تم اچھے مسیحا ہو شفا کیوں نہیں دیتے
مٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کرو گے
منصف ہو تو اب حشر اٹھا کیوں نہیں دیتے

لیکن جیسا کہ فیضؔ کی صحبتوں اور ان کی تحریروں سے بھی اندازہ ہوا کہ اس وقتی اداسی اور افسردگی کو ہی ایک حساس دل و دماغ کا لازمی حصہ سمجھتے تھے لیکن ایک بار انہوں نے خود کہا تھا کہ دیکھنا یہ چاہیے کہ فیضؔ کا غالب حصہ افسردگی و اداسی پر مبنی ہے یا امید اور رجائیت پر۔ چنانچہ اسی 'دست تہہ سنگ' میں ایک نظم 'شورش زنجیر بسم اللہ' میں ایک بار پھر امتحانِ عشق سے گذرنے کا عزم ابھر آیا ہے۔ یہ نظم یوں ختم ہوتی ہے ؂

ستم کی داستاں، کشتہ دلوں کا ماجرا کہیے
جو زیر لب نہ کہتے تھے وہ سب کچھ برملا کہیے
مصر ہے محتسب رازِ شہیدانِ وفا کہیے
لگی ہے حرف ناگفتہ پر اب تعزیر بسم اللہ
سرِ مقتل چلو بے زحمتِ تقصیر بسم اللہ
ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ

اسی میں کئی جگہ یہ رخ آیا ہے کہ ابھی امتحان باقی ہے اور اپنے نصب العین کی حفاظت اور اس کے حصول کے لیے ابھی ایک آخری جنگ باقی ہے۔ یہ دعوی تو بقول فیضؔ اہلِ ستم کا ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ وہ جنگ ہو بھی چکی لیکن ایسا حقیقتاً ہوا ہی نہیں ؂

تم یہ کہتے ہو وہ جنگ ہو بھی چکی
جس میں رکھا نہیں ہے کسی نے قدم
کوئی اُترا نہ میداں میں، دشمن نہ ہم
کوئی صف بن نہ پائی، نہ کوئی علم

منتشر دوستوں کو صدا دے سکا
اجنبی دشمنوں کا پتا دے سکا
تم یہ کہتے ہو وہ جنگ ہو بھی چکی

'دست تہہ سنگ' میں چند نظمیں فیضؔ کی انتہائی ملال انگیز کیفیات کا اظہار کرتی ہیں، کیونکہ ان ہی ایام میں مارشل لاء کے ہاتھوں انقلابی لیڈر کامریڈ حسن ناصر کو قلعۂ لاہور میں نذرِ اجل کر دیا گیا۔ اسی زمانے میں بائیں بازو کے ایک محترم لیڈر دادا فیروز الدین منصور کا انتقال ہوا۔ فیضؔ کے لیے یہ صدمے انتہائی جانکاہ تھے۔ حسن ناصر کے لیے ان کے یہ دو مرثیے ہیں ایک کا عنوان ہے 'ملاقات مری' اور دوسرے کا ہے 'ختم ہوئی بارش سنگ' ان کیفیات کا شدید اظہار اس مجموعے کی کئی غزلوں میں بھی ہوا ہے۔

نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش دل ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو تن داغ داغ لٹا دیا
مرے چارہ گر کو نوید ہو صف دشمناں کو خبر کرو
جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا
کرو کج جبیں پہ سر کفن مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا
جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

اسی دور میں ملک کے دگرگوں حالات کے پیشِ نظر بعض دوستوں کے مشورے پر فیضؔ پاکستان سے باہر چلے گئے لیکن وطن کی محبت اور اس کے مسائل اسی طرح ان کا پیچھا کرتے رہے جیسا کہ وطن میں رہنے سے ان کے ساتھ سائے کی طرح رہتے تھے۔ وطن کی یاد میں ان کی یہ نظم بڑی دل سوزی اور دردمندی کا رخ پیش کرتی ہے۔

دیارِ یار تری جوششِ جنوں پہ سلام
مرے وطن تیرے دامانِ تارتار کی خیر

رواں رہے یہ روایت، خوشا ضمانتِ غم
نشاطِ ختمِ غمِ کائنات سے پہلے
ہر اک کے ساتھ رہے دولت امانتِ غم
کوئی نجات نہ پائے نجات سے پہلے
سکون ملے نہ کبھی تیرے پافگاروں کو
جمالِ خونِ سرِ خار کو نظر نہ لگے
اماں ملے نہ کہیں تیرے جاں نثاروں کو
جلالِ فرقِ سرِ دار کو نظر نہ لگے

یہ نظم لندن میں لکھی گئی ہے اس کے بعد فیضؔ کا قیام زیادہ تر روس میں رہا۔ اس دور میں فیضؔ کا طرزِ احساس ایک بار پھر رومانیت کی طرف رخ کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے جیسے ان کی نظم 'جب تیری سمندر آنکھوں میں' یا 'رنگ ہے دل کا مرے' جس کے آخری مصرعے یہ ہیں۔

اب جو آئے ہو تو ٹھہرو کہ کوئی رنگ، کوئی رُت، کوئی شے
ایک جگہ پر ٹھہرے،
پھر سے اِک بار ہر اک چیز وہی ہو کہ جو ہے
آسماں حدِ نظر، راہ گزر راہ گزر شیشۂ مے شیشۂ مے

ایک اور نظم 'پاس رہو' اپنی شدت احساس کے علاوہ تمثیلات اور امیجری کی وجہ سے بھی غیر معمولی ہے۔ کہتے ہیں۔

تم مرے پاس رہو
میرے قاتل، مرے دلدار، مرے پاس رہو
جس گھڑی رات چلے،
آسمانوں کا لہو پی کے سیہ رات چلے
مرہم مشک لیے، نشترِ الماس لیے
بین کرتی ہوئی، ہنستی ہوئی، گاتی نکلے
درد کے کاسنی پازیب بجاتی نکلے

فیض کوایک حس کو دوسری حس میں تبدیل کرنے کافن خوب آتا ہے دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی بند چوٹ لگتی ہے تو وہ جگہ نیلی یا کاسنی ہو جاتی ہے۔ اس مشاہدے کو فیض نے ایک غیر معمولی جمالیاتی علامت میں ڈھال دیا ہے۔ 'درد کے کاسنی پازیب بجاتی نکلے' حقیقتاً یہ شاعری نہیں ساحری ہے۔

'دست تہہ سنگ' میں کئی غزلیں ایسی ہیں جن کے اشعار بہت مقبول ہوئے جیسے یہ اشعار۔

تری امید ترا انتظار جب سے ہے
نہ شب کو دن سے شکایت، نہ دن کو شب سے ہے
کسی کا درد ہو کرتے ہیں تیرے نام رقم
گلہ ہے جو بھی کسی سے ترے سبب سے ہے

ایک اور غزل کے یہ اشعار۔

آج یوں موج در موج غم تھم گیا اس طرح غم زدوں کو قرار آ گیا
جیسے خوشبوئے زلف بہار آ گئی جیسے پیغام دیدارِ یار آ گیا
سرفروشی کے انداز بدلے گئے، دعوتِ قتل پر مقتل شہر میں
ڈال کر کوئی گردن میں طوق آ گیا، لاد کر کوئی کاندھے پہ دار آ گیا

ایک غزل کے یہ اشعار بھی بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

ترے غم کو جاں کی تلاش تھی ترے جاں نثار چلے گئے
تری رہ میں کرتے تھے سر طلب سر رہگزار چلے گئے
نہ سوالِ وصل نہ عرض غم نہ حکایتیں نہ شکایتیں
ترے عہد میں دل زار کے سبھی اختیار چلے گئے
یہ ہمیں تھے جن کے لباس پر سرِرہ سیاہی لکھی گئی
یہی داغ تھے جو سجا کے ہم سرِ بزم یار چلے گئے
نہ رہا جنونِ رخِ وفا، یہ رسن یہ دار کرو گے کیا
جنہیں جرمِ عشق پہ ناز تھا وہ گنہگار چلے گئے

اس طرح 'دست تہہ سنگ' میں مختلف کیفیات اپنے اپنے پس منظر کے ساتھ ابھرتی ہیں۔ یہ

مجموعہ فیضؔ کی زندگی کے نہایت اہم دور کی یادگار ہے اور وہ کشمکش اس میں جگہ جگہ نمایاں ہے کہ جو حال کے انسانیت سوز حالات اور مستقبل کے روشن ہدف کی تلاش کے مابین مسلسل ہوتی رہتی ہے اور جس سے حوصلے، ضبط اور خوش دلی کی ساتھ گذرنا اور اسے شاعری کے بہترین اظہار میں لانا فیض احمد فیضؔ کا وصف رہا ہے۔

’سرِ وادیِ سینا‘۔ ایک تجزیہ

فیضؔ کی زندگی پر نظر ڈالیں تو کئی اعتبار سے وہ دنیا کے خوش قسمت ترین انسانوں میں شمار ہونے کے لائق ہیں لیکن لڑکپن سے اور وفات تک جس طرح کے مسائل سے وہ گذرے ان کی بھی کوئی اور مثال ملنی مشکل ہے۔ فیضؔ صاحب ایوب خان کے مارشل لاء کے زمانے ہی میں کراچی منتقل ہو گئے تھے اور یہاں ہارون فیملی کی درخواست پر عبداللہ ہارون کالج لیاری میں پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ کراچی کے علاقے نرسری میں ان کا قیام تھا۔ یہ دور زیادہ تر آشوب اور ہنگاموں سے عبارت تھا۔ اسی زمانے میں ایوب خان کے خلاف تحریکیں چلیں۔ اسی تسلسل میں مشرقی پاکستان کے پُر آشوب حالات نے سر اٹھایا اور بنگلہ دیش کی تشکیل عمل میں آئی۔ گویا یہ دور فیضؔ صاحب کے لیے اطمینان اور سکون کا نہیں تھا۔ اس سے پہلے عرب اسرائیل کی جنگ سے وہ پوری طرح وابستہ ہو چکے تھے۔ خود پاکستان میں قتل و غارت گری کے ایسے واقعات رونما ہوئے کہ فیضؔ کا قلم اس حکایتِ خونچکاں کو لکھنے کے لیے آمادہ ہوتا رہا۔

’سرِ وادیِ سینا‘ فیضؔ کا پانچواں شعری مجموعہ ہے یہ ۱۹۷۱ء میں فیضؔ کے قیامِ کراچی کے دوران مرتب ہوا اور ایک طرح سے اس کی ترتیب اور اشاعت کے سارے مرحلوں میں مجھے بھی شرکت کا شرف حاصل رہا۔ فیضؔ صاحب نے چند ایک نظموں اور غزلوں کی نشاندہی کی کہ اگر کسی طرح یہ فراہم ہو جائیں تو شاملِ کتاب کر دیں گے۔ میں نے وہ کلام فیضؔ صاحب تک پہنچا دیا۔ اسی مجموعے کے لیے انہوں نے دو مضامین ترجمے کے لیے مجھے دے دیئے۔ ایک اقبالؔ اور فیضؔ کے انگریزی زبان میں ترجمہ کرنے والی شخصیت اور مؤرخ وی جی کیرنن اور دوسرا الیگزنڈر سُرکوف کا

وہ دیباچہ تھا جو انہوں نے روسی زبان میں فیض کے کلام پر تحریر کیا تھا۔ آرٹس کونسل آف پاکستان کی تیسری عالمی کانفرنس میں ماسکو سے اردو کی اسکالر آٹرین میکسی وینکو نے بتایا کہ یہ الیگزنڈر نہیں۔ الیکسی سرکوف کا لکھا ہوا ہے۔ لیکن اب تو 'نسخہ ہائے وفا' میں بھی یہی نام شائع ہوتا ہے۔ دراصل اس وقت بھی فیضؔ صاحب کئی امور میں پوری قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ مثلاً سُرکوف کے مقدمے کو یہ کہہ کر انہوں نے میرے حوالے کیا کہ یہ مریم ساگا نیک نے لکھا ہے، حالانکہ بعد میں اصل مصنف کے نام کو حتمی حیثیت حاصل ہوئی۔

'سروادیٔ سینا' کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ عرب اسرائیل جنگ کا گہرا تاثر اس نظم اور اس مجموعے کی کئی نظموں میں موجود ہے۔ فیض نے یہ مجموعہ جب مکتبۂ دانیال کے مالک ملک نورانی کے سپرد کیا جو فیضؔ کے دوست بھی تھے تو یہ شرط رکھی کہ کتاب اچھے گیٹ اَپ کے ساتھ شائع ہوگی اور قیمت کم سے کم رکھی جائے گی۔ چنانچہ اس وقت 'سروادیٔ سینا' کی قیمت پانچ روپے رکھی گئی تھی۔ اس کا سرورق فیضؔ صاحب کی صاحبزادی سلیمہ ہاشمی نے بنایا تھا۔ اس مجموعے میں ۱۹۷۱ء کی جنگ اور اس کے مضمرات کی جھلک فیضؔ کے کلام میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ ان کی نظم 'لہو کا سراغ' کراچی میں ہونے والی ایک متعصبانہ خونریزی پر لکھی گئی تھی جس کا اختتام اس طرح ہوتا ہے۔

پکارتا رہا بے آسرا یتیم لہو\
کسی کو بہرِ سماعت نہ وقت تھا نہ دماغ\
نہ مدعی نہ شہادت، حساب پاک ہوا\
یہ خونِ خاک نشیناں تھا رزقِ خاک ہوا

یہ جنوری ۱۹۶۵ء کی نظم ہے اور ایوب خان کے انتخاب کے فوراً بعد لکھی گئی تھی۔ اس انتخاب میں محترمہ فاطمہ جناح ایوب خان کے مقابل کھڑی ہوئی تھیں۔ اسی تسلسل میں فیض نے یہ قطعہ بھی کہا تھا۔

زنداں زنداں شورِ اناالحق، محفل محفل قلقلِ مے\
خونِ تمنا دریا دریا، دریا دریا عیش کی لہر\
دامن دامن رت پھولوں کی، آنچل آنچل اشکوں کی\
قریہ قریہ جشن بپا ہے، ماتم شہر بہ شہر

اس پر ایک وضاحتی نوٹ بھی ہے کہ گلاب کا پھول سابق صدر ایوب خان کا انتخابی نشان تھا۔
'سروادیٔ سینا' کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۹۶۵ء میں فیضؔ نے زیادہ تر وہ کلام لکھا ہے جو اس میں شامل ہے کئی نظموں میں کراچی کے آشوب ناک حالات کا تاثر ہے جیسے 'یہاں سے شہر کو دیکھو' پھر چونکہ ۱۹۶۵ء کی جنگ ہندوستان سے چھڑ گئی تھی اس لیے 'بلیک آؤٹ' جیسی نظم بھی اس مجموعے میں موجود ہے۔ جنگ کا یہ تسلسل اسرائیل عرب کی جنگ ۱۹۶۷ء تک پہنچ گئی۔ اس نظم میں فیضؔ کے یہ مصرعے بطور خاص ذہن کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

ایک پل ٹھہرو کہ اس پار کسی دنیا سے
برق آئے مری جانب ید بیضا لے کر

'ید بیضا' اور 'وادیٔ سینا' یہ ایک ہی تلازمے کو ظاہر کرتے ہیں اور اس میں فیضؔ کا وہ انداز نمایاں ہے کہ ایک طرف انہیں ان جنگوں کا دکھ بھی ہے اور دوسری طرف یہ یقین بھی۔

آج کے دن نہ پوچھو مرے دوستو
کب تمہارے لہو کے دریدہ علم
فرق خورشیدِ محشر پہ ہوں گے رقم
از کراں تا کراں کب تمہارے قدم
لے کے اٹھے گا وہ بحر خوں یم بہ یم
جس میں دھل جائے گا آج کے دن کا غم
سارے درد و الم سارے جور و ستم
دور کتنی ہے خورشید محشر کی لو
آج کے دن نہ پوچھو مرے دوستو

اسی مجموعے کو فیضؔ نے ماہ و سال کی ترتیب سے مرتب کیا ہے۔ اس طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۱ء تک ان کے تخلیقی عمل کو کن مراحل سے گذرنا پڑا۔ اس مجموعے میں ملی جلی کیفیات زیادہ ہیں۔ فیضؔ کے قریبی حلقے جانتے ہیں کہ اسی زمانے میں ان کی ایک محبوب ہمیشہ کے لیے ان سے جدا ہو گئی۔ اس کے لیے مرثیے لکھے ہیں اور بڑی دردمندی سے انہیں یاد کیا ہے۔ جیسے یہ غزل۔

چاند نکلے کسی جانب تیری زیبائی کا
رنگ بدلے کسی صورت شب تنہائی کا

اور ایک اور غزل جس کا مطلع یہ ہے۔

کب تک دل کی خیر منائیں کب تک رہ دکھلاؤ گے
کب تک چین کی مہلت دو گے کب تک یاد نہ آؤ گے
بیتا دید امید کا موسم، خاک اُڑتی ہے آنکھوں میں
کب بھیجو گے درد کا بادل کب برکھا برساؤ گے
فیضؔ دلوں کے بھاگ میں ہے گھر بھرنا بھی لٹ جانا بھی
تم اس حسن کے لطف و کرم پر کتنے دن اتراؤ گے

ملکی حالات، عالمی آشوب اور ذاتی صدمات فیضؔ کو ایک ایسے مرحلے پر لے آئے جہاں انہیں ہارٹ اٹیک ہو گیا۔ اس پر بھی انہوں نے اپنی یہ نظم اس طرح ختم کی ہے۔

سارے دکھتے ہوئے ریشوں کی طنابیں کھل کر
سلسلہ وار پتا دینے لگیں
رخصتِ قافلۂ شوق کی تیاری کر
اور جب یاد کی بجھتی ہوئی شمعوں میں نظر آیا کہیں
ایک پل آخری لمحہ تیری دلداری کا
درد اتنا تھا کہ اس سے بھی گزرنا چاہا
ہم نے چاہا بھی مگر دل نہ ٹھہرنا چاہا

اس مجموعے میں فیضؔ کا وہ تاثر بھی نمایاں ہے جو مخالفین کی افترا پردازی کے سبب پیدا ہوا تھا۔ لکھتے ہیں۔

ہم پہ وارفتگیٔ ہوش کی تہمت نہ دھرو
ہم کہ رمازِ رموزِ غمِ پنہانی ہیں
اپنی گردن پہ بھی ہے رشتہ فگن خاطرِ دوست
ہم بھی شوقِ رہِ دلدار کے زندانی ہیں

جب بھی ابروئے درِ یار نے ارشاد کیا
جس بیاباں میں بھی ہم ہوں گے چلے آئیں گے
در کھلا دیکھا تو شاید تمہیں پھر دیکھ سکیں
بند ہوگا تو صدا دے کے چلے جائیں گے

فیضؔ صاحب کے یہاں بنگلہ دیش کی پوری تحریک کے دوران میرا آنا جانا رہا۔ ایک دن ان کی میز پر ایک نظم لکھی نظر آئی میں نے پوچھا یہ تازہ نظم ہے تو کاغذ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ نظم یہ تھی۔

سجے تو کیسے سجے قتلِ عام کا میلہ
کسے لبھائے گا مرے لہو کا واویلا

اگلے دن ایک غزل کے اشعار سامنے تھے۔

اماں کیسی کہ موج خوں ابھی سر سے نہیں گزری
گزر جائے تو شاید بازوئے قاتل ٹھہر جائے
کوئی دم بادبانِ کشتیٔ صہبا کو تہہ رکھو
ذرا ٹھہرو، غبار خاطر محفل ٹھہر جائے

'سروادیٔ سینا' بھی فیضؔ کا ایک غیر معمولی شعری مجموعہ ہے کیونکہ اس میں 'دعا' جیسی نظم بھی موجود ہے۔

آیئے ہاتھ اٹھائیں ہم بھی
ہم جنہیں رسم دعا یاد نہیں
ہم جنہیں سوزِ محبت کے سوا
کوئی بت کوئی خدا یاد نہیں

....

کہ جن کا دیں پیرویٔ کذب و ریا ہے ان کو
ہمتِ کفر ملے، جرأتِ تحقیق ملے
جن کے سر منتظر تیغ جفا ہیں ان کو
دشتِ قاتل کو جھٹک دینے کی توفیق ملے

'سرِ وادیٔ سینا' کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے اس میں 'سرِ وادیٔ سینا' کے تاریخی حوالے موجود ہیں اور اس ایقان پر نظم ختم ہوتی ہے۔

پھر برق فروزاں ہے سرِ وادیٔ سینا،
اے دیدۂ بینا
پھر دل کو مصفّیٰ کرو اس لوح پہ شاید
مابینِ من و تو نیا پیماں کوئی اترے
اب رسمِ ستم حکمتِ خاصانِ زمیں ہے
تائیدِ ستم مصلحتِ مفتیٔ دیں ہے
اب صدیوں کے اقرارِ اطاعت کو بدلنے
لازم ہے کہ انکار کا فرماں کوئی اترے

جیسا کہ ابتدا میں کہا گیا یہ زمانہ فیضؔ کے لیے انتہائی غم زدگی اور دلخراشی کا زمانہ تھا۔ ایک ناتمام شہر آشوب کے یہ اشعار اس وقت کے فیضؔ کے محسوسات کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔

اب بزمِ سخن، صحبتِ لب سوختگاں ہے
اب حلقۂ مے طائفۂ بے طلباں ہے
گھر رہیے تو ویرانیٔ دل کھانے کو آوے
رہ چلیے تو ہر گام پہ غوغائے سگاں ہے
یاں اہلِ جنوں یک بہ دگر دست و گریباں
واں جیشِ ہوس تیغ بکف در پئے جاں ہے
اب صاحبِ انصاف ہے خود طالبِ انصاف
مہر اس کی ہے میزان بدستِ دگراں ہے
ہم سہل طلب کون سے فرہاد تھے لیکن
اب شہر میں تیرے کوئی ہم سا بھی کہاں ہے

'سرِ وادیٔ سینا' کے آخر میں داغستان کے ملک الشعرا رسول حمزہ کے کلام کا بھی فیضؔ نے منظوم ترجمہ کیا ہے جو کئی نظموں پر مشتمل ہے خاص طور پر یہ نظم خود فیضؔ کے شاعرانہ ہنر کو پوری طرح اجاگر

'شام شہر یاراں' ۔ جذبات وکیفیات کے نئے رنگوں کا مرقع

فیض کے کلام سے ادبی حلقوں کے علاوہ عوام کو زیادہ دلچسپی رہی ہے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر مداحینِ فیض نہ صرف یہ خواہش رکھتے تھے کہ کسی طرح ان کا تازہ کلام دستیاب ہو جائے اور اسی طرح عام قارئین کے ذوق وشوق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ناشر حضرات بھی کسی نہ کسی نئے مجموعے کی تالیف پر فیض صاحب کو متوجہ کرتے رہتے تھے۔ 'شام شہر یاراں' ایک ایسا ہی مجموعہ ہے جس کا اقرار فیض نے خود بھی اپنے ایک مختصر شذرے میں کیا ہے۔ اس کے علاوہ جب ہم اس کتاب کی فہرست پر نظر ڈالتے ہیں تو اس میں پانچ نثری مضامین اور انٹرویو شامل نظر آتے ہیں۔ اسی طرح ایک حصہ 'فرمائشیں' کے زیرِ عنوان ہے چار پنجابی کی نظمیں ہیں اور آخر میں چار منظوم تراجم بھی شریک کیے گئے ہیں۔ اس سے پہلے کے حصے میں نظمیں، غزلیں اور گیت شامل ہیں۔ اس اعتبار سے یہ مجموعہ خاص اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں بعض اہم واقعات فیض کی نجی اور ذاتی زندگی کے متعلق یکجا ہو گئے ہیں ورنہ فیض صاحب تو ذاتی گفتگو اور اپنی ذات سے متعلق واقعات کو بیان کرنے سے ہمیشہ کتراتے رہے۔ ٹی۔ ایس ایلیٹ نے جب یہ بات کہی تھی کہ شاعری کو شاعر کی شخصیت سے الگ کر کے دیکھنا چاہیے کیونکہ شاعر کی شخصیت تو ایک عمل انگیز (catalyst) کی حیثیت رکھتی ہے اسی لیے وہ اس کے حق میں نہیں ہیں کہ کسی شاعر کی سوانح عمری کو اس کے کلام کے مطالعے کی بنیاد بنائی جائے۔ اسی نقطۂ نظر کی ایلیٹ نے بھرپور وکالت کی ہے لیکن اسے ہم محض ایک نیم صداقت کا نام دے سکتے ہیں کیونکہ جب تک شاعر کے عقائد، اس کی زندگی کے نشیب و فراز اور تجربات کا اندازہ نہ ہو کسی بھی شعری تخلیق کا سیاق ہی بدل سکتا ہے۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ

شاعری کی تفہیم میں ایسی جزئیات زیادہ معنی نہیں رکھتیں لیکن کبھی کبھی بعض نتائج ایسے اخذ کر لیے جاتے ہیں کہ جو تاریخی اور واقعاتی اعتبار سے غلط ہو سکتے ہیں۔ مثلاً مرزا غالبؔ کی غزل کا ایک حصہ جو قطعے کی شکل میں موجود ہے اس میں یہ شعر بھی شامل ہے۔

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اِک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خاموش ہے

اسے تاریخی شواہد کی عدم موجودگی میں ناقدین اور شارحین نے آخری مغل تاجدار بہادر شاہ سے منسوب کیا اور انہیں دِلّی کی آخری شمع قرار دیا اور اس کا سلسلہ ۱۸۵۷ء کے خونیں واقعات سے جوڑ دیا جب کہ یہ غزل غالبؔ نے اس سے بہت پہلے لکھی تھی۔ اس نقطۂ نظر سے جو نثری حصہ فیضؔ کے اس مجموعے میں شامل ہے وہ ان کی گذشتہ اور آئندہ شاعری کو سمجھنے میں معاون و مددگار ثابت ہوتا ہے۔

اس سے پہلے فیضؔ کی ایک نظم 'ہارٹ اٹیک' کا تذکرہ ہو چکا ہے جو ان کے مجموعے 'سروادیٔ سینا' میں شامل ہے اسی طرح کا ایک تجربہ ان کی نظم 'جس روز قضا آئے گی' میں شامل ہے۔ اس نظم کی طرف فیضؔ نے اپنے نثری مکالموں میں بھی اشارہ کیا ہے اور جس طرح انہوں نے زندگی کے دیگر خطرات کو آنکھیں چار کر کے قبول کیا اسی طرح قضا کو بھی ایک محبوب کی ہی طرح قبول کرنے کا زاویہ پیدا کیا۔

کس طرح آئے گی جس روز قضا آئے گی
شاید اس طرح کہ جس طور کبھی اوّل شب
بے طلب پہلے پہل مرحمت بوسۂ لب
جس سے کھلنے لگیں ہر سمت طلسمات کے در
اور کہیں دور سے انجان گلابوں کی بہار
یک بہ یک سینۂ مہتاب کو تڑپانے لگے

نظم ان مصرعوں پر ختم ہوتی ہے۔

جس طرح آئے گی جس روز قضا آئے گی
خواہ قاتل کی طرح آئے کہ محبوب صفت
دل سے بس ہوگی یہی حرفِ ودع کی صورت

للہ الحمد بانجامِ دلِ دل زدگاں
کلمۂ شکر بنام لب شیریں دہناں

'ہارٹ اٹیک' ۱۹۶۷ء کی نظم ہے اور یہ نظم ۱۹۷۲ء میں لکھی گئی ہے۔ گویا اس عرصے میں فیض پر جو کچھ بیتی انہوں نے قضا کو بھی محبوب صفت پیکر میں دیکھا اور اپنی شاعری کا ایک اور زاویہ غمِ جاناں اور غمِ دوراں کے علاوہ پیدا کرلیا۔ یہ زاویہ جو ہر ذی نفس کے لیے اِک ناگزیر تجربے کی حیثیت رکھتا ہے۔

اسی زمانے میں فیض کو روس کی ان ریاستوں میں جانے کا موقع ملا جہاں انہوں نے اشک آباد، دوشنبہ، سمرقند، تاشقند اور بخارا کے تاریخی مقامات کی سیر کی اور جمہوریۂ ترکمان میں تاریخ کے پارینہ اوراق کو جیتے جاگتے ماحول میں دیکھا۔ 'اشک آباد کی شام' اسی سفر کی یادگار ہے۔

فیض کی زندگی میں کئی المیے اسی طرح رونما ہوئے کہ ان کا شدید احساس ان کی شاعری کے بعض حصوں میں نمایاں نظر آتا ہے۔ سجاد ظہیر کا انتقال بھی فیض کے ان ہی المیوں میں سے ایک ہے۔ جب وہ ستمبر ۱۹۷۳ء میں سجاد ظہیر کی آخری رسوم میں شریک ہونے کے لیے دہلی گئے تو یہ نظم لکھی جس کا آغاز یوں ہوتا ہے۔

نہ اب ہم ساتھ سیرِ گل کریں گے
نہ اب مل کے سرِ مقتل چلیں گے
حدیث دلبراں باہم کریں گے
نہ خونِ دل سے شرحِ غم کریں گے

یہ نظم سجاد ظہیر کے ساتھ بسر کیے ہوئے شب و روز اور طویل رفاقت کی آئینہ دار ہے۔ اسی میں سجاد ظہیر کی شخصیت کا عکس یوں ابھرتا ہے۔

صبا اور اس کا اندازِ تکلم
سحر اور اس کا آغازِ تبسم

نظم کا اختتام خاصے (desperate) انداز میں ہوتا ہے۔

بساط بادہ و مینا اٹھالو
بڑھا دو شمع محفل بزم والو

پیو اب ایک جام الوداعی

پیو اور پی کے ساغر توڑ ڈالو

اس مجموعے میں اگرچہ کلام مختصر ہے لیکن اس کا تنوع غیر معمولی ہے۔ اسی میں وہ مشہور غزل نما نظم ہے جو فیضؔ نے پہلی بار بنگلہ دیش جا کر لکھی تھی اور جس کا عنوان ہے 'ڈھاکہ سے واپسی پر' اس غزلیہ کے تمام اشعار ان تمام واقعات کو تازہ کر دیتے ہیں جو سابق مشرقی پاکستان میں رونما ہوئے تھے۔ فیضؔ اس تعصب کو یوں بیان کرتے ہیں جس میں ماضی کے حوالے بھی ہیں اور حال کی خلش بھی۔

هم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی مداراتوں کے بعد

پھر بنیں گے آشنا کتنی ملاقاتوں کے بعد

کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار

خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد

ایسے موقعوں پر جس میں جذبے کچھ اور کہتے ہوں اور سیاست کی مصلحتیں کچھ اور کہتی ہوں، تو جذبوں کا اظہار اتنا آسان نہیں ہوتا۔ فیضؔ کا یہ مقطع اس کیفیت کو اچھی طرح واضح کر رہا ہے۔

ان سے جو کہنے گئے تھے فیضؔ جاں صدقہ کیے

ان کہی ہی رہ گئی وہ بات سب باتوں کے بعد

ایک طرف اس طرح کی افسردگی اور ملال کی کیفیت لیے ہوئے اشعار بھی اس مجموعے میں ہیں اور اس کے علاوہ ایسی نظمیں اور گیت بھی کہ جن میں فیضؔ کے بہار انگیز جذبے اپنے تمام رنگوں اور خوشبوؤں کے ساتھ اجاگر ہوتے ہیں 'اے شام مہرباں ہو' اور یہ گیت۔

چلو پھر سے مسکرائیں

چلو پھر سے دل جلائیں

جو گزر گئی ہیں راتیں

انہیں پھر جگا کے لائیں

جو بسر گئی ہیں باتیں

انہیں یاد میں بلائیں

چلو پھر سے دل لگائیں
چلو پھر سے مسکرائیں

اور یہ نظم جس کا عنوان ہے 'بہار آئی' ایک نئی کیفیت کو اجاگر کرتی ہے اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ فیض کو شاید امید کی کوئی کرن شب تار کو چیرتی ہوئی نظر آنے لگی۔

بہار آئی تو جیسے یک بار
لوٹ آئے ہیں پھر عدم سے
وہ خواب سارے، شباب سارے
جو تیرے ہونٹوں پہ مرمٹے تھے
جو مٹ کے ہر بار پھر جیئے تھے
نکھر گئے ہیں گلاب سارے
جو تیری یادوں سے مشکبو ہیں

امید کی کرن ہی کا اثر ہے کہ فیض بینکاری کی ایک اور اصطلاح سے کام لیتے ہوئے اپنے نظریاتی عشق کا اکاؤنٹ کھولنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں۔

غبار خاطر کے باب سارے
ترے ہمارے
سوال سارے جواب سارے
بہار آئی تو کھل گئے ہیں
نئے سرے سے حساب سارے

لیکن زمانہ کسی کی خواہش اور جذبے کا تابع نہیں ہوتا۔ اسی لیے گردشِ وقت نے بہار وخزاں، دھوپ اور چھاؤں کو انسانی زندگی کا لازمہ بنا رکھا ہے۔ خوشی اور غم، ملال اور شادمانی، امید اور ناامیدی کی یہ کشمکش تغیرِ زمانہ کے تابع رہی اور فیض اس کا اظہار کرتے رہے۔ ان کی نظم 'تم اپنی کرنی کر گزرو' ایک بار پھر خود سے اور اپنے رفیقوں سے خطاب ہے کہ حالات جو بھی ہوں اپنا کام کرتے رہنا چاہیے۔

اب کیوں اس دن کا ذکر کرو
جب دل ٹکڑے ہو جائے گا

اور سارے غم مٹ جائیں گے

جو کچھ پایا کھو جائے گا

جو مل نہ سکا وہ پائیں گے

....

یہ دن تو کتنی بار آیا ہے

سو بار بسے اور اجڑ گئے

سو بار لٹے اور بھر پایا

....

تم خوف و خطر سے درگزرو

جو ہونا ہے سو ہونا ہے

گر ہنسنا ہے تو ہنسنا ہے

گر رونا ہے تو رونا ہے

تم اپنی کرنی کر گزرو

جو ہوگا دیکھا جائے گا

فیض صاحب ۱۹۷۶ء میں کراچی یونیورسٹی کے ایک مشاعرے میں تشریف لائے تھے اس وقت وہ حسن ناصر اور سجاد ظہیر پر لکھے ہوئے مرثیے سنانا چاہتے تھے لیکن کچھ طالب علموں نے انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی۔ فیض صاحب نے حسبِ عادت تحمل اور بردباری کا ثبوت دیا۔ ان طلبا کو اپنے پاس اسٹیج پر بلالیا اور پانچ سات منٹ تک کچھ ایسی باتیں کیں کہ وہ سب دوبارہ عقیدت سے ان کے ہاتھ چومنے لگے۔ اس وقت اپنے کئی تازہ اشعار فیض صاحب نے سنائے جن میں استعاروں کی ندرت غیر معمولی طور پر ظہور کر رہی تھی اور اس کا بھرپور احساس ہوا کہ فیض تھکے ہیں اور نہ خود کو دہرا رہے ہیں۔ تازہ کاری ان کے ان اشعار میں نمایاں تھی۔

ہمیں سے اپنی نوا ہم کلام ہوتی رہی

یہ تیغ اپنے لہو میں نیام ہوتی رہی

مقابل صف اعدا جسے کیا آغاز

وہ جنگ اپنے ہی دل میں تمام ہوتی رہی
کوئی مسیحا نہ ایفائے عہد کو پہنچا
بہت تلاش پسِ قتلِ عام ہوتی رہی

ایک اور غزل جو انہوں نے سنائی تھی اس کا انداز یہ تھا۔

یہ کس خلش نے پھر اس دل میں آشیانہ کیا
پھر آج کس نے سخن ہم سے غائبانہ کیا
غمِ جہاں ہو، رخِ یار ہو کہ دستِ عدو
سلوک جس سے کیا ہم نے عاشقانہ کیا
خوشا کہ آج ہر اِک مدعی کے لب پر ہے
وہ راز جس نے ہمیں راندۂ زمانہ کیا

اس شعر کو سن کر فیضؔ کا وہ اظہار بے ساختہ یاد آ گیا جو اسیری کے زمانے میں انہوں نے یوں کیا تھا۔

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیضؔ گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

اس مجموعے میں کئی نظمیں تجسس اور اپنی ذات کا از سرِ نو جائزہ لینا ظاہر کرتی ہیں۔ مثلاً

آج اِک حرف کو پھر ڈھونڈتا پھرتا ہے خیال
مدھ بھرا حرف کوئی زہر بھرا حرف کوئی
دل نشیں حرف کوئی، قہر بھرا حرف کوئی
آج ہر موج ہوا سے ہے سوالی خلقت
لا کوئی نغمہ، کوئی صوت تری عمر دراز

اور غالبؔ کے ایک شعر کی فضا سے استفادہ کرتے ہوئے نظم ان مصرعوں پر ختم کی ہے۔

نوحۂ غم ہی سہی، شورِ شہادت ہی سہی
صورِ محشر ہی سہی، بانگِ قیامت ہی سہی

ان تمام کیفیات کے ساتھ ساتھ در امید سے ہٹنے کو فیض ابھی تیار نہیں ہوئے۔ ان کا عزم بھی

غالبؔ کے اس عزم سے مطابقت رکھتا ہے۔

موج خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اٹھ جائیں گے کیا؟

چنانچہ فیضؔ کہتے ہیں۔

پھریرے بن کے میرے تن بدن کی دھجیاں
شہر کے دیوار و در کو رنگ پہنانے لگیں
پھر کف آلودہ زبانیں مدح و ذم کی قمچیاں
میرے ذہن و گوش کے زخموں پہ برسانے لگیں

....

ہم کہ ہیں کب سے در امید کے دریوزہ گر
یہ گھڑی گزری تو پھر دست طلب پھیلائیں گے
کوچہ و بازار سے پھر چن کے ریزہ ریزہ خواب
ہم یونہی پہلے کی صورت جوڑنے لگ جائیں گے

اس مجموعے میں 'لینن گراڈ کا گورستان' اور 'نذرِ خسرو' اور 'کچھ عشق کیا کچھ کام کیا' جیسی نظمیں بھی شامل ہیں۔ یہ آخری نظم فیضؔ کے مزاج کو پوری طرح ظاہر کرتی ہے۔

وہ لوگ بہت خوش قسمت تھے
جو عشق کو کام سمجھتے تھے
یا کام سے عاشقی کرتے تھے
ہم جیتے جی مصروف رہے
کچھ عشق کیا، کچھ کام کیا
کام عشق کے آڑے آتا رہا
اور عشق سے کام الجھتا رہا
پھر آخر تنگ آ کر ہم نے
دونوں کو ادھورا چھوڑ دیا

یہ ادھوراپن تو بڑے بڑے آدرش وادیوں کے ہاں نظر آتا ہے جبھی تو کہا گیا ہے۔

کارِ دنیا کسے تمام نکرد

اس کتاب میں جو حصہ فرمائشیوں سے متعلق ہے ان میں ایک مرثیۂ امام حسین ہے ایک پرانی نظم ہے جو حسین شہید سہروردی کی مدح میں لکھی گئی ہے کیونکہ انہوں نے راولپنڈی سازش کیس میں ملزموں کی جانب سے وکالت کی تھی۔ پھر کچھ گیت ہیں جو کہ فلم 'قسم اس وقت کی'، 'جاگو ہوا سویرا' اور 'سکھ کا سپنا' کے لیے لکھے گئے تھے۔ آخری حصے میں 'پنجابی نظماں' کے عنوان سے ایک گیت اور چار نظمیں ہیں۔ اگر چہ فیضؔ نے کئی بار یہ بات کہی ہے کہ ہم پنجابی میں اس لیے شعر نہیں کہتے کہ ہمیں اس زبان اور اظہار پر وہ قدرت حاصل نہیں جو بابا بلھے شاہ، وارث شاہ، سلطان باہو اور شاہ حسین جیسے شعرا کو حاصل تھی۔ تاہم فیضؔ نے اس نظم میں اس فضا کو کچھ نہ کچھ حاصل کر ہی لیا ہے۔

لمی رات سی درد فراق والی
تیرے قول تے اساں وساہ کر کے
کوڑا گھٹ کیتی مٹھڑے یار میرے
مٹھڑے یار میرے، جانی یار میرے
تیرے قول تے اساں وساہ کر کے
جھانجھراں وانگ، زنجیراں چھنکائیاں نیں
کدی کنیں منددراں پائیاں نیں

ان نظموں میں بھی فیض کا وہی نصب العین ہے کہ انسانیت کی دنیا سدا آباد رہے۔ ۱۹۷۴ء کے سیلاب کے امدادفنڈ کے لیے جو نظم لکھی ہے اس میں یہ مصرعے نمایاں ہیں۔

سن ہاڑے اس مسکین دے
ربا پورا کر سوال
میری جھوک وسّے، میرا ویر وسّے

'شام شہر یاراں' کے آخر میں تراجم شامل ہیں جن میں ناظم حکمت (زنداں سے ایک خط) 'ویرا کے نام' اور 'وا میرے وطن' اس کے علاوہ قازقستان کے ممتاز نوجوان شاعر عمر علی سلیمان کی

نظم 'صحرا کی رات' شامل ہیں۔ اس اعتبار سے یہ مجموعہ مختصر ہونے کے باوجود زبان و بیان، تجربات و واقعات، جذبات و کیفیات کے کئی نئے رنگ اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور اسے فیضؔ کی شاعری کے مطالعے میں یقیناً خاص اہمیت حاصل ہے۔

'مرے دل مرے مسافر'۔ ایک پُر آشوب عہد کی شاعری

انسانی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جائے گا کہ کرۂ ارض پر امن وسکون کی مدت زیادہ رہی ہے یا آشوب وانتشار کی۔ بیسویں صدی کا نصف آخر برصغیر اور پوری دنیا کے لیے پُر آشوب دور رہا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ نصف اول میں دو بڑی عالمی جنگیں ہوئیں اور ان کے اثرات اور مضمرات سے دنیا کا کوئی ملک محفوظ نہیں رہ سکا۔ لیکن حصولِ آزادی کے بعد پاکستان میں جیسا ہونا چاہیے تھا وہ بوجوہ نہیں ہو سکا۔ تریسٹھ چونسٹھ سال کے عرصۂ آزادی میں آدھا زمانہ فوجی آمریت ہی کے سائے میں گذرا۔ فیضؔ کے ایسے نظریاتی اور محبِّ وطن انسان کو وقفے وقفے سے ابتلا اور آزمائش سے گذرنا پڑا۔ عمر کے آخری زمانے میں فیضؔ صاحب یہ کہتے تھے کہ بھئی اب اسیری اور قید و بند کی صعوبتیں سہنے کی سکت ہم میں نہیں ہے۔ اور ویسے بھی ان کی زندگی کے متعدد فیصلوں میں ایلس فیض اور ان کے قریبی دوستوں کا ہاتھ رہا ہے۔ چنانچہ ۷۰ء کی دہائی میں ایک بار پھر ملک کے حالات ایسے ہوئے کہ فیضؔ کو جلاوطنی کی زندگی پر مجبور ہونا پڑا۔ اس وقت بھی یقیناً ناصحوں نے یہ سمجھایا ہوگا کہ اب اپنے دیرینہ عشق سے باز آجایئے کیونکہ اس میں رنج وغم کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا اور فیضؔ نے آخر دم تک اپنے مسلک پر قائم رہنے کے لیے جواباً حافظ شیرازی کا یہ شعر اپنی کتاب 'مرے دل مرے مسافر' کے شروع میں درج کر دیا۔

ناصحم گفت بجز غم چہ دارد عشق
بروائے خواجۂ عاقل ہنرے بہتر ازیں

'مرے دل مرے مسافر' میں زیادہ تر کلام وہی ہے جو فیضؔ نے دنیا کے مختلف شہروں میں قیام

کے دوران تخلیق کیا۔ ان میں لندن، ماسکو، سمرقند، تاشقند اور بیروت شامل ہیں۔ یہ شعری مجموعہ بھی مکتبۂ دانیال ہی سے شائع ہوا تھا اور اس کی تقریبِ اجرا پریس کلب میں منعقد کی گئی تھی۔ ایلس فیض، سبطِ حسن اور آمنہ مجید ملک بطور خاص اس تقریب میں شریک تھے۔ بعد میں جب فیض صاحب پاکستان کچھ عرصے کے لیے آئے تو مجھ سے کہا کہ میں ایک مضمون کا ترجمہ آپ سے کروا کر اس کتاب میں شامل کرنا چاہتا تھا لیکن ان لوگوں نے عجلت سے کام لیا اور اس میں اس طرح کی کوئی چیز شامل نہ ہو سکی۔

اس مجموعے میں بھی فیض کی ایک اور محبوب شخصیت مخدوم محی الدین کی جدائی کا بھی عکس ملتا ہے۔ یہ نظم مخدوم کے بارے میں ہے اور دو نظمیں مخدوم کی یاد میں اور ایک دکنی غزل اس میں شامل ہیں۔ مخدوم کی غزلوں سے ایک ایک مصرعہ منتخب کر کے مخدوم کی زمینوں ہی میں غزلیں تخلیق کی ہیں۔

'آپ کی یاد آتی رہی رات بھر'
چاندنی دل دکھاتی رہی رات بھر
گاہ جلتی ہوئی، گاہ بجھتی ہوئی
شمعِ غم جھلملاتی رہی رات بھر
کوئی خوشبو بدلتی رہی پیرہن
کوئی تصویر گاتی رہی رات بھر

اور پھر یہ غزل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

'اسی انداز سے چل بادِ صبا آخر شب'

....

یاد کا پھر کوئی دروازہ کھلا آخر شب
دل میں بکھری کوئی خوشبوئے قبا آخر شب
صبح پھوٹی تو وہ پہلو سے اٹھا آخر شب
وہ جو اِک عمر سے آیا نہ گیا آخر شب
چاند سے ماند ستاروں نے کہا آخر شب
کون کرتا ہے وفا عہدِ وفا آخر شب

یہ دونوں غزلیں اور ایک دکنی غزل ماسکو میں لکھی گئی ہیں۔ شان الحق حقی نے ایک غزل میں لکھا تھا۔

'ہم کو لندن میں بھی دِلّی کی زباں آتی ہے'

فیضؔ نے بھی ماسکو میں دِلّی اور دکن کی زبانیں یکجا کر کے اپنے محبوب اور اس کی نظریاتی تجسیم کو اس طرح پیش کیا۔

کچھ پہلے ان آنکھوں آگے کیا کیا نہ نظارا گزرے تھا
کیا روشن ہو جاتی تھی گلی جب یار ہمارا گزرے تھا

جلاوطنی کا تجربہ بجائے خود دل و دماغ کے لیے ایک تخلیقی محرک بن سکتا ہے اس سے قبل فیضؔ نے جب غیر ممالک میں مختصر قیام کیے تو وہ ان کی اپنی مرضی اور سیر و سیاحت یا کسی دعوت کا نتیجہ تھا۔ لیکن اس بار انہیں اس کیفیت سے گذرنا پڑا۔

مرے دل مرے مسافر
ہوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم
دیں گلی گلی صدائیں
کریں رخ نگر نگر کا
کہ سراغ کوئی پائیں
کسی یار نامہ بر کا
ہر اک اجنبی سے پوچھیں
جو پتا تھا اپنے گھر کا
سرِ کوئے ناشنایاں
ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اِس سے بات کرنا
کبھی اُس سے بات کرنا
تمہیں کیا کہوں کہ کیا ہے

شبِ غم بری بلا ہے
ہمیں یہ بھی تھا غنیمت
جو کوئی شمار ہوتا
ہمیں کیا برا تھا مرنا
اگر ایک بار ہوتا!

اس نظم کا تاثر بہت گہرا ہے کیونکہ جب یہ غزل آ جائے کہ ہر اجنبی سے اپنے گھر کا پتہ پوچھنا پڑ جائے اور ناشناسوں سے دن رات گذارنے کے لیے ضرورتاً مکالمہ کرنا پڑ جائے تو اس سے بڑی آفت اور کیا ہو سکتی ہے اور یہ بار بار کی بے وطنی اور دیارِ غیر میں زندگی بسر کرنے کا عذاب ایک بار ہی ہوتا تو برداشت کر لیتے۔ یہاں فیضؔ نے مصحفیؔ اور غالبؔ سے استفادہ کرتے ہوئے نظم یوں ختم کی ہے۔

ہمیں کیا برا تھا مرنا
اگر ایک بار ہوتا

فیضؔ کا یہ شعر جدید عہد کے کئی پرچموں کا سرنامہ بنتا رہا ہے۔

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

فیضؔ کی ساری شاعری اسی شعر کی عکاس و آئینہ دار ہے۔ ان کی شاعری میں رسمیات اور وقتی تقاضوں کا دخل نہیں۔ کبھی وہ لمحے کو آفاقی کر دیتے ہیں اور کبھی آفاقیت کو ایک لمحے میں سمیٹ لیتے ہیں۔ اسی لیے ان کی شاعری کتابی حوالہ نہیں رکھتی جیتی جاگتی زندگی کا حوالہ رکھتی ہے اور زندگی کسی سیدھی لکیر کا نام نہیں۔

اس کے پیچ و خم اور نشیب و فراز سے وہی آگاہ ہوتا ہے جس نے تین کھونٹ چھوڑ کر چوتھے کھونٹ کی سمت سفر کرنے کا آغاز کر دیا ہو۔ فیضؔ کا نظریاتی سفر اور اس میں غمِ جاناں کی آمیزش اور جمالیاتی اظہار اسی چوتھے کھونٹ کے سفر کی روداد ہے۔ وہ سفر جس سے فیضؔ آخری سانس تک دستبردار نہیں ہوئے۔ یہ نہیں کہ فیضؔ ہمیشہ پرچم بلند کرنے اور رجائیت کی شمعیں جلانے ہی پر شعر کہتے رہے۔ زندگی کے ماحول میں اگر تیرگی نظر آئی، اگر آس پاس کے گلستان میں پھول

مرجھا گئے اور شمعیں بے نور ہو گئیں اور آئینے چکنا چور ہو گئے تو اس کا اظہار بھی فیضؔ نے پوری صداقت کے ساتھ کیا لیکن جس طرح کوئی نگاہ دوربین ٹوٹتے ستاروں کے ساتھ ساتھ روشن ہونے والے نئے ستاروں کو بھی دیکھ لیتی ہے اسی طرح فیضؔ نے ان مصرعوں پر اپنی نظم ختم کی ہے۔

اور ان بادلوں کے پیچھے
دور اس رات کا دُلارا
درد کا ستارا
ٹمٹما رہا ہے
جھنجھنا رہا ہے
مسکرا رہا ہے

اسی زمانے میں ماسکو میں افرو ایشین مصنفین کا قیام عمل میں آیا۔ فیضؔ اس کے سربراہ مقرر ہوئے اور اس کی کئی اچھی اور بامقصد نشستیں بھی ہوئیں اور اسی سے فیضؔ کو یہ امید بندھی کہ تیس کی دہائی کی طرح باضمیر اور روشن خیال ادیب اور شاعر دنیا کے ماحول کو کچھ نہ کچھ تو تبدیل کر دیں گے۔ چنانچہ ایک نظم میں ظالم و مظلوم کی آوازوں کا ارتعاش پیدا کرنے کے بعد فیضؔ اپنی نظم 'تین آوازیں' کو ندائے غیب پر یوں ختم کرتے ہیں۔

ہر اِک اولیِ الامر کو صدا دو
کہ اپنی فردِ عمل سنبھالے
اٹھے گا جب جم سرفروشاں
پڑیں گے دار و رسن کے لالے
کوئی نہ ہوگا کہ جو بچا لے
جزا سزا سب یہیں پہ ہوگی
یہیں عذاب و ثواب ہوگا
یہیں سے اُٹھے گا شور محشر
یہیں پہ روز حساب ہوگا

اسی ڈکشن کو قرآنی تلمیحات کے ساتھ فیضؔ نے بعد میں ایک اور نظم میں بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ اس نظم کا عنوان بھی عربی میں ہے یعنی 'ویبقیٰ وجہ ربک'۔ اس نظم میں فیضؔ کہتے ہیں۔

ہم دیکھیں گے
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے
جو لوحِ ازل میں لکھا ہے
جب ظلم و ستم کے کوہِ گراں
روئی کی طرح اُڑ جائیں گے
ہم محکوموں کے پاؤں تلے
جب دھرتی دھڑ دھڑ دھڑکے گی
اور اہلِ حکم کے سر اوپر
جب بجلی کڑ کڑ کڑکے گی
جب ارضِ خدا کے کعبے سے
سب بت اٹھوائے جائیں گے
ہم اہلِ صفا، مردودِ حرم
مسند پہ بٹھائے جائیں گے
سب تاج اچھالے جائیں گے
سب تخت گرائے جائیں گے
بس نام رہے گا اللہ کا
جو غائب بھی ہے حاضر بھی
جو منظر بھی ہے ناظر بھی
اور راج کرے گی خلقِ خدا
جو میں بھی ہوں اور تم بھی ہو

اس نظم کے ان مصرعوں میں قرآنی آیات کا ایک اشارہ ملتا ہے۔ فیضؔ نے ان آیات کا ترجمہ تو

نہیں کیا ہے، لیکن قیامت کی جو نشانیاں ان میں بیان کی گئی ہیں انہیں تاثراتی پیرائے میں ایک عام فہم اسلوب اختیار کرتے ہوئے ادا کر دیا ہے۔ فیضؔ کی شاعری میں حرم اور وہاں سے نکالے جانے والے بت ایک تلازمے کی صورت میں کئی جگہ آئے ہیں۔

دل میں اب یوں ترے بھولے ہوئے غم آتے ہیں
جیسے بچھڑے ہوئے کعبے میں صنم آتے ہیں

اور جنہیں ظلم وستم کے پیکروں نے راندۂ درگاہ اور مردودِ حرم قرار دیا یعنی عام اور بے وسیلہ انسان وہ خلقِ خدا ہیں اور فیضؔ کا یہ ایقان ہے کہ اس زمینی قیامت کے بعد خلقِ خدا ہی راج کرے گی۔ ان کی پوری شاعری اس یقین کا سرچشمہ ہے۔

فیضؔ کا یہ مجموعہ اور اس کے بعد جو کلام 'غبارِ ایام' کے نام سے مرتب ہوا ہے۔ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ ان نظموں کی تخلیق کا بیشتر حوالہ فلسطین اور اس میں رونما ہونے والے المناک واقعات ہیں۔ فیضؔ خود بھی بیروت میں مقیم رہے اور 'لوٹس' جیسے رسالے کے مدیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے اس وقت کے عرب کاز کو انہوں نے بہت تقویت پہنچائی۔ اس کا اعتراف خود یاسر عرفات نے اپنے ایک خط میں بھی کیا ہے۔ فیضؔ چونکہ عربی زبان سے آشنا تھے اس لیے اس وقت فلسطین، عرب اسرائیل جنگ اور مجاہدین کی قربانیوں کے بارے میں جو شاعری عربی زبان میں کی جارہی تھی وہ ان کے پیشِ نظر تھی۔ ان شعرا میں نظار قبانی، معین بسی سیو، سمیع القاسم اور محمود درویش بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ اس وقت عربی میں جو ترانہ زبان زدِ خاص و عام تھا اسے بھی فیضؔ نے اپنے خاص انداز میں اردو کا روپ دیا۔ 'فلسطینی بچے کے نام' اور 'فلسطینی شہدا جو پردیس میں کام آئے' فیضؔ کے جذبۂ آزادی اور فلسطینیوں سے ان کے نظری رشتے اور تعلقِ خاطر کی عمدہ مثال ہیں۔ 'مرے دل مرے مسافر' کے شروع میں فیضؔ نے حافظؔ کا جو شعر لکھا ہے اس کی توضیح ایک غزل کے روپ میں بھی پیش ہوئی ہے۔ جس کا آخری شعر یہ ہے۔

عشق میں کیا ہے غم کے علاوہ
خواجۂ من! کچھ اس سے زیادہ

جلاوطنی کی زندگی میں جو محسوسات ہوتے ہیں انہیں فیضؔ کی کئی غزلوں میں نمایاں طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے مثلاً ان کی غزلوں کے یہ اشعار۔

اب کے برس دستورِ ستم میں کیا کیا باب ایزاد ہوئے
جو قاتل تھے مقتول ہوئے جو صید تھے اب صیاد ہوئے

پہلے بھی طواف شمع وفا تھی، رسم محبت والوں کی
ہم تم سے پہلے بھی یہاں منصور ہوئے فرہاد ہوئے

فیضؔ نہ ہم یوسف نہ کوئی یعقوب جو ہم کو یاد کرے
اپنی کیا، کنعاں میں رہے یا مصر میں جا آباد ہوئے

....

غم بہ دل، شکر بہ لب، مست و غزل خواں چلیے
جب تلک ساتھ ترے عمر گریزاں چلیے

نذر مانگے جو گلستاں سے خداوندِ جہاں
ساغرِ مے میں لیے خونِ بہاراں چلیے

امتحاں جب بھی ہو منظور جگرداروں کا
محفلِ یار میں ہمراہ رقیباں چلیے

....

ابھی بادباں کو تہہ رکھو ابھی مضطرب ہے رخ ہوا
کسی راستے میں ہے منتظر وہ سکوں جو آ کے چلا گیا

فیضؔ نے اپنی شاعری کے کئی مقامات پر ان نظریات اور افکار کو چیلنج کیا ہے جو عام طور پر ذرائع ابلاغ کے وسیلے سے معاشرے میں پھیلائے جاتے ہیں اور پھر واضح الفاظ میں ایسے نکتہ نظر کی تردید کی ہے۔

ستم سکھلائے گا رسم وفا، ایسے نہیں ہوتا
صنم دکھلائیں گے راہِ خدا ایسے نہیں ہوتا

گنو سب حسرتیں جو خوں ہوئی ہیں تن کے مقتل میں
مرے قاتل! حساب خوں بہا ایسے نہیں ہوتا

ہر اک شب ہر گھڑی گزرے قیامت یوں تو ہوتا ہے
مگر ہر صبح ہو روزِ جزا ایسے نہیں ہوتا

رواں ہے نبضِ دوراں، گردشوں میں آسماں سارے
جو تم کہتے ہو سب کچھ ہو چکا، ایسے نہیں ہوتا

....

جو تمہاری مان لیں ناصحا، تو رہے گا دامنِ دل میں کیا
نہ کسی عدو کی عداوتیں نہ کسی صنم کی مروّتیں
چلو آؤ تم کو دکھائیں ہم جو بچا ہے مقتل شہر میں
یہ مزار اہلِ صفا کے ہیں، یہ ہیں اہلِ صدق کی تربتیں

'مرے دل مرے مسافر' کی نظموں میں دو نظمیں گہرا تاثر مرتب کرتی ہیں۔ اب اس میں فیضؔ کی لفظیات بھی قدرے مختلف ہیں۔ ایک نظم ہے 'یہ ماتمِ وقت کی گھڑی ہے' اس میں ندیا، نیاّ، کھویاّ، گجر جیسے سادہ الفاظ کے ساتھ ساتھ جامۂ روز و شب گزیدہ، پیراہنِ دریدہ، فرمان جوشِ وحشت، لعل لب ہائے مہوشاں کی ایک ملی جلی لفظی کہکشاں نظر آتی ہیں۔ اس زمانے کی شاعری میں فیضؔ نے 'زنجیر روز و شب' کا استعارہ کئی جگہ استعمال کیا ہے اور اس سے ان کا اپنے زمانے کے ساتھ تعلق اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ اس فضا میں جب وطن اور اہلِ وطن یاد آتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اسیری کے زمانے کے فیض احمد فیضؔ اپنی ان ہی کیفیات میں گم ہو چکے ہیں۔ اس سے پہلے بھی انہوں نے ایسے شعر کہے ہیں ؎

تم آ رہے ہو کہ بجتی ہیں میری زنجیریں
نہ جانے کیا مرے دیوار و بام کہتے ہیں

اس مجموعے میں ان کی نظم 'میرے ملنے والے' یوں شروع ہوتی ہے ؎

وہ در کھلا میرے غم کدے کا
وہ آ گئے میرے ملنے والے
وہ آ گئی شام، اپنی راہوں میں
فرش افسردگی بچھانے
وہ آ گئی رات چاند تاروں کو
اپنی آزردگی سنانے

وہ صبح آئی دمکتے نشتر سے
یاد کے زخم کو منانے

نظم کے آخر میں فیض نے وطن کی یاد کو ایک نئے پیرائے میں یوں ادا کیا ہے۔

خیال سوئے وطن رواں ہے
سمندروں کی ایال تھامے
ہزار وہم و گماں سنبھالے
کئی طرح کے سوال تھامے

اس مجموعے میں پیرس کی بھی کچھ جھلکیاں ہیں۔ پولینڈ کے ممتاز نغمہ ساز شوپین سے متعلق بھی ان کی ایک نظم ہے جو ترجمہ ہے۔ قفقاز کے شاعر قاسن قلی کی ایک نظم کا۔ اسی طرح پیرس کے عنوان سے بھی ایک نظم اس طرح اختتام پذیر ہوتی ہے۔

زیرِ لب
شرح بے دردیٔ ایام کی تمہید لیے
اور کوئی اجنبی
ان روشنیوں سایوں سے کتراتا ہوا
اپنے بے خواب شبستاں کی طرف جاتا ہوا

فیض کی شاعری کے مختلف ادوار کا الگ الگ مطالعہ ان کے کلام کی روشنی میں ایک نئے تجربے سے دوچار کرتا ہے۔ زندگی پر یقین از سرِ نو تازہ ہو جاتا ہے اور فیض کی مثال سامنے رکھ کر یہ بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ عشق خواہ کسی فرد سے ہو، انسانیت سے ہو یا کسی نصب العین سے، اس میں جدو جہد کرنے والے کو بھی ہر تجربے سے گذرتے ہوئے خوشدلی اور حوصلہ مندی کا ثبوت دینا چاہیے۔ اس کا ایک رخ فیض کی ان نظموں میں زیادہ ابھرا ہے جو انہوں نے 'قوالی' کے نام سے اپنے کئی مجموعوں میں شامل کی ہیں۔ قوالی ہمارے کلچر کا ایک اہم حصہ ہے امیر خسرو سے اس کی دیرینہ نسبت بیان کی جاتی ہے۔ انہوں نے قول اور قلبانہ کا اضافہ کر کے اس کے آہنگ اور تاثیر میں بے پایاں اضافہ کیا۔ فیض نے 'ہم بھی دیکھیں گے'، 'بسم اللہ'، اور 'شب ہا' اور 'یارب ہا' جیسے لفظی آہنگوں سے قوالی کا تاثر ابھارا ہے جس سے اِک نوع کی سرخوشی اور سرمستی کی فضا پیدا ہو

جاتی ہے اور یوں لگتا ہے جیسے پورا ماحول اور گردوپیش کی پوری دنیا تالیوں کی تال اور جذبوں کے دھمال میں ڈھل گئی ہے۔ قوالی سے فیضؔ کی دلچسپی کے کئی زاویے ہو سکتے ہیں۔ ایک تو انہیں تصوف کے اس رخ کی پسندیدگی حاصل تھی۔ پھر موسیقی سے بھی انہیں گہرا شغف تھا۔ مشہور موسیقار خورشید انور ان کے ہم جماعت بھی تھے اور عرصے تک ایک دلی دوست کی طرح ایک ساتھ وقت بسر کیا۔ پھر فیضؔ کے بارے میں جو ایک رائے شروع سے ظاہر کی جاتی رہی ہے کہ ان کے کلام میں زیرِ لب اظہار زیادہ، بلند آہنگی اور جوش وخروش کم ہے، شاید اس کمی کو انہوں نے قوالی کی صنف سے پورا کیا اور پھر 'لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے' جیسی نظموں سے وہ کام لیا کہ جسے فیضؔ جیسے شاعر کے لیے ایک لازمی جہت سمجھا جا سکتا ہے۔ اب فیض کی شاعری خواص وعوام کی تفریق سے بلند ہو کر ان انسانوں کے لیے وقف ہو گئی ہے جو ان کی صدا پر کان دھرنے کا حوصلہ اور ذوق رکھتے ہیں۔

فیضؔ اور 'غبارِ ایام'

فیضؔ کے تذکرے میں ناگزیر طور پر اقبالؔ کا بھی حوالہ آ جاتا ہے۔ اس میں کچھ بدیہی امور شامل ہیں جن کا اعادہ اقبالؔ شناسوں اور فیضؔ فہموں کے لیے شاید اتنا ضروری نہ ہو البتہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ جب شاعری، نظریے، فلسفۂ حیات، انقلاب اور انسان دوستی کا کوئی تذکرہ چھڑ جائے تو اقبالؔ کے سائبان ہی میں فیضؔ بھی نشستہ نظر آتے ہیں۔

اقبالؔ اور فیضؔ کی ابتدائی شاعری کو دیکھیے تو دونوں کے یہاں رومانیت کا گہرا عکس نظر آئے گا۔ لیکن یہ رومانیت وہ نہیں جو اقبالؔ اور فیضؔ کے درمیان آنے والے شاعروں اختر شیرانی، جوش اور حفیظ جالندھری کے یہاں نظر آتی ہے۔ اقبالؔ اور فیضؔ کی رومانیت کا رشتہ مغرب کے تصور رومانیت سے ملتا ہے۔ اقبالؔ کی شاعری خواہ وہ 'ہمالہ سے خطاب ہو' یا 'حقیقت حسن' اور اس طرح کی دیگر نظموں میں، ورڈز ورتھ کی رومانیت زیادہ نظر آتی ہے کیونکہ اس میں بھی ورڈز ورتھ کی طرح فطرت پسندی اور فطرت سے ہم آہنگی کو اقبالؔ نے بھی خاص اہمیت دی ہے۔ ورڈز ورتھ نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا 'Let nature be my teacher'۔

اقبالؔ نے بھی فطرت کے مظاہر سے اور کائنات سے وابستہ فطرت کے تغیرات سے اپنی شاعری کا خاصا مواد حاصل کیا ہے اور اپنی شاعری کو تازہ محاکات اور علامات سے ثروتمند بنایا ہے۔

اے ہمالہ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں — چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں

....

آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی — کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی

آئینہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی   سنگِ رہ سے گاہ بچتی، گاہ ٹکراتی ہوئی

رومانیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ماضی کے ادوار گذشتہ کی بہترین روایات کو ازسرِ نو تلاش کرکے ان کی بازیابی کی کوشش کی جائے جیسا کہ کیٹس نے ہیلینیت (Hellenistic) روایات کی بازیابی پر زور دیا تھا۔ اقبالؔ نے بھی اپنی نظم کا اختتام اس شعر پر کیا ہے۔

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

انگلستان کے رومانی شعرا کو دو طبقوں میں تاریخی اعتبار سے تقسیم کیا گیا ہے۔ ابتدائی رومانی شعرا ورڈزورتھ اور کولرج ہیں۔ ان کے بعد آنے والوں بائرن، شیلے اور کیٹس میں شیلے کی رومانیت میں انقلاب اور اس کیفیت کا احاطہ ہے جسے فیضؔ نے بھی 'مجاہدے' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ فیضؔ کی رومانیت پر ہمیں شیلے کا اثر زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ تصور، جو انقلاب کی فکر سے ذہن کو ہم رشتہ کردیتا ہے رومانیت سے آگے کی منزل ہے۔ چنانچہ اقبالؔ بھی رومانیت ہی سے نظریے کی طرف آئے اور فیضؔ کی رومانیت بھی آگے چل کر اس نکتے پر منتج ہوئی۔

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

....

اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجیے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجیے

....

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

یہ طرزِ احساس اقبالؔ اور فیضؔ کے یہاں اپنے گرد و پیش کے مسائل اور زمینی حقائق سے پیدا ہوا ہے جسے ایک شاعر کی حساسیت ہی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اقبالؔ نے اپنے مزاج اور نظریے کے مطابق تاریخ کے ان حوالوں سے تعلق قائم کیا اور اپنے عہد کے ان نظریوں اور شخصیات سے آگاہی حاصل کی جو اقبالؔ کے نظریۂ انقلاب کو تقویت دے سکتے تھے۔ اس میں اقبالؔ کا ذہن ہر قسم کے تعصب سے آزاد تھا۔ اسی لیے اگر وہ جمال الدین افغانی کے پان اسلام ازم کو مانتے تھے اور کہتے تھے۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے

تو دوسری طرف انہیں روس کی سرزمین، اس کے انقلاب، کارل مارکس اور لینن کے نظریات سے بھی تخلیقی دلچسپی تھی۔ چنانچہ انہوں نے روس کے ۱۹۱۷ء کے انقلاب کا یوں خیر مقدم کیا تھا۔

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تک

....

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

....

اب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر روزِ مکافات

....

دست دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکوٰۃ

فیض کی طرزِ فکر میں بھی یہی ارتقا نظر آتا ہے۔ انہیں فطری طور پر ان تحریکوں اور نظریوں سے دلچسپی پیدا ہوئی جو مظلوم اور استحصال زدہ طبقوں کی فلاح کے لیے انقلاب لانا چاہتے تھے اور جو بھوک، جہل، افلاس اور جنگ سے نبرد آزما ہو کر امن اور خوشحالی، حلاوت اور روشنی کی فرمانروائی کو عزیز رکھتے ہیں۔ اس وقت برصغیر پاک و ہند انگریزوں کی غلامی میں اسیر تھا اور دوسری طرف اشتراکی فلسفوں کے ماننے والے اپنے اپنے ماحول اور زمینی حقائق کے مطابق مصروفِ عمل تھے۔ فیض کو بھی نظریاتی طور پر ایسے حوالوں اور سرچشموں سے استفادے کا موضوع مل گیا۔ اپنے ذہنی تغیر اور انقلابی فکر کی طرف مائل ہونے کے پس منظر کو فیض نے کئی جگہ رقم کیا ہے، لیکن ان کی کتاب 'مہ وسال آشنائی' مکمل طور پر روس، کارل مارکس اور لینن سے اثر پذیری کی روداد پر مشتمل ہے۔ اس کا آغاز بقول فیض ۱۹۳۵ء سے ہوتا ہے جب وہ امرتسر کالج میں پڑھا رہے تھے۔ ان کے ایک رفیقِ کار صاحبزادہ محمود الظفر نے ایک پتلی سی کتاب فیض کے حوالے کی اور کہا لو یہ پڑھو اگلے ہفتے

ہم سے اس پر بحث کرو۔ لیکن کتاب غیر قانونی ہے اس لیے ذرا احتیاط سے رکھنا۔ یہ کتاب تھی 'کمیونسٹ مینی فیسٹو'۔

فیضؔ نے یہ کتاب دو تین بار پڑھ ڈالی اور اس میں بیان کردہ مباحث کو غور سے ذہن نشین کیا۔ فیضؔ کہتے ہیں 'یوں محسوس ہوا کہ کسی نے اس پورے خزینۂ اسرار کی کنجی ہاتھ میں تھما دی ہے۔ یوں سوشل ازم اور مارکسزم سے اپنی دلچسپی کی ابتدا ہوئی۔ پھر لائبریری سے لے کر لینن کی کتابیں پڑھیں اور یوں لینن کے اکتوبر انقلاب اور اس کی انقلابی سرزمین سے واقفیت کی شدت سے طلب ہوئی۔ انقلاب کے بارے میں جان ریڈ کی کتاب 'Ten Days That Shook The World'، وسط ایشیا کے جوشوآ کنٹز کی کتاب 'Dawn Over Samarkand' مطالعہ کی اور پھر سوویت معاشرے کے بارے میں سڈنی اور بیٹرس ویب کی کتاب، ڈین ہیولیٹ جانسن، مارس ڈاب اور لندن کے لیفٹ بک کلب کی شائع کردہ دوسری کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد فیضؔ نے اہم شخصیتوں کا تذکرہ کیا جو کمیونسٹ پارٹی اور پاکستان اور ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھیں۔ یہ روسی ادیبوں مثلاً گورکی، مایا کوفسکی، شولوخوف، الیکسی ٹالسٹائی، ایلیا اہرن برگ اور جس جس کا بھی انگریزی ترجمہ دستیاب ہوا ذوق وشوق سے پڑھا۔ اس ضمن میں فیضؔ نے سعادت حسن منٹو کا بھی تذکرہ کیا ہے کہ جو قریب قریب ہم عمر ہونے کے باوجود ان دنوں کالج میں رسمی طور پر فیضؔ کے شاگرد تھے۔ وہ ہر دوسرے چوتھے دن کسی نہ کسی روسی ادیب کی کتاب اور اس کا ترجمہ اٹھائے ان کے ہاں بحث یا اپنے ترجموں کی ترمیم وتصحیح کے لیے آیا کرتے (ایضاً ص ۱۳۔۱۲)

انہوں نے جہاں روس اور وسط ایشیائی تاریخ پر نظر رکھی وہیں ۱۹۱۹ء کے سانحہ جلیانوالہ باغ اور ۱۹۲۰ء کی خلافت کی ہجرت تحریک پر بھی اپنی توجہ دی۔ فیضؔ نے انقلابِ روس کی کامیابی اور زارِ روس کی سلطنت کی بیخ کے ساتھ ساتھ انہوں نے انقلاب کی جو تصویر بنائی تھی وہ بقول فیضؔ کافی رومانی اور مثالی تھی۔ جس کی ہر تفسیر حقیقت پر مبنی نہیں تھی۔ اسی زمانے میں 'ہندوستان چھوڑ دو' کی تحریک انٹرنیشنل کانگریس نے مسترد کی تو فیضؔ امرتسر کو خیر باد کہہ کر لاہور آ گئے۔ اس وقت جاپانی جنگ بازوں اور نازی ستم رانوں اور ہٹلر اور مسولینی کی فسطائیت نے فیضؔ کی نظریاتی فضا کو اور زیادہ واضح کر دیا۔ اتحادی فوجیں فسطائیت کے خلاف سینہ سپر ہو گئیں اور جرمن فوجوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد فیضؔ نے اپنے ان تجربات کا بھی تذکرہ کیا ہے جو وقتاً فوقتاً روس کے مختلف

شہروں میں جانے سے انہیں حاصل ہوئے کیونکہ ان کا کہنا ہے کہ اس زمانے میں انہوں نے سوویت یونین کی ایک خیالی تصویر ذہن میں بنا رکھی تھی۔ پہلی بار ۱۹۵۸ء میں کچھ ردوقد کے بعد پاکستان سے صرف دو آدمیوں کو تاشقند جانے کی اجازت ملی۔ ایک ابوالاثر حفیظ جالندھری صاحب اور ایک فیضؔ۔ فیضؔ کے اس سفر میں کئی روسی ادیبوں سے مراسم پیدا ہوگئے۔ ایک تعطل کے بعد فیضؔ ۱۹۶۷ء میں دوبارہ تاشقند گئے، جہاں انہوں نے ایوتوشنکو کے بارے میں لکھا ہے 'ماسکو اسٹیڈیم میں جہاں کوئی بیس پچیس ہزار تماشائیوں کی گنجائش ہے، مشہور شاعر ایوتوشنکو کو سننے کے لیے خلقت امڈی آرہی تھی۔ داخلے پر بہت بھاری ٹکٹ لگایا گیا تھا جب ہم اندر پہنچے تو کہیں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی'۔ غرض فیضؔ نے جو کچھ 'مہ و سالِ آشنائی' کے حوالے سے لکھا ہے اس میں بہت دلچسپ معلومات بھی ہیں اور کئی اہم کتابوں اور مصنفین کے کلام کی تاثیر کا بھی تذکرہ آیا ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ 'ماسکو میں قیام کے دوران سجاد ظہیر (بنّے) کے کمرے میں ہم لوگ جمع تھے۔ مجھ سے شعر کی فرمائش ہوئی، تو میں نے روزنبرگ والی نظم 'ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے' کچھ تمہید کے ساتھ سنائی اور اس کے بعد جب اس کا انگریزی ترجمہ ختم کیا تو ایک صاحب جو کونے میں خاموش بیٹھے تھے اچانک اٹھے اور آنکھوں پر رومال رکھ کر روتے ہوئے باہر چلے گئے۔ کسی کی زبانی معلوم ہوا کہ یہ امریکہ کے مشہور ترقی پسند سیاسی مبصر اور مصنف البرٹ کاہن ہیں جو روزنبرگ کے ذاتی دوست تھے اور آج کل اس جوڑے کے یتیم بچے ان ہی کی تحویل میں ہیں۔' (ص ۳۸)

فیضؔ نے اس کتاب میں جگہ جگہ روس کی سیاحت کے دوران پاکستان کے بھی مختلف علاقوں، جھیلوں، دریاؤں اور پہاڑوں کو بھی یاد کیا ہے۔ اسی دوران انہوں نے چلی کے مشہور شاعر اور مفکر پابلو نرودا سے ہونے والی پہلی ملاقات کا تذکرہ کیا ہے۔ نرودا کے علاوہ رسول حمزہ، ناظم حکمت، ایلیا اہرن برگ، سارتر، سلیمانوف، چنگیز اتماتوف کی ذاتی صحبتوں کا بھی دلچسپ تذکرہ موجود ہے۔ آخر میں ایسی نظمیں بھی ہیں جو یا تو روس کے مختلف شعرا کے تراجم ہیں یا وہ نظمیں جو قیامِ روس کے دوران فیضؔ نے لکھی تھیں۔

فیضؔ ایک صاحبِ بصیرت اور روحِ عصر کی نبض کو پہچاننے والے دانشور تھے۔ انہیں یقیناً بعد کے برسوں میں روس کے اندر ہونے والی سیاسی تبدیلیوں کا علم بھی ہوگا اور احساس بھی۔ لیکن پوری کتاب میں خروشیف یا گورباچوف کے سیاسی اقدامات کا انہوں نے کہیں ذکر نہیں کیا۔ لدمیلا نے

اپنی کتاب 'پرورشِ لوح وقلم' میں لکھا ہے کہ عرب اسرائیل جنگ کے بعد فیضؔ کو ماسکو میں پہلا جیسا اطمینان نہیں ملا۔ وہ کیوں؟ ایک تو یہ کہ اب فیضؔ سوویت نظام کی نوکرشاہانہ دیواروں سے ٹکرانے لگے۔ دوسرے یہ کہ وہ اس کے حکمرانہ طور طریقوں کو اس کی بدچلنی، رشوت ستانی وغیرہ کو زیادہ قریب سے دیکھ رہے تھے۔ وہ خامیاں اور خرابیاں جن کو گذشتہ برسوں میں دیکھ کر فیضؔ ان دیکھا کرتے یا قابلِ اصلاح غلطی سمجھ کر 'درگزر' کر دیتے تھے، اب ان کی آنکھوں میں کھٹکتی تھیں۔' اسی طرح افروایشیائی مصنفین کی تحریک میں بھی جو ناگوار صورتِ حال پیدا ہو رہی تھی اور ماسکو میں اس تحریک کے 'بے قابو' ہونے کی بات ماسکو میں چھپانے کی پوری کوشش کی جاتی تھی، لیکن ایسا نہیں کہ فیض کو، جو 'لوٹس' کے مدیرِ اعلیٰ تھے، اس کی خبر نہ ہو۔ لُدمیلا لکھتی ہیں۔ 'فطرتاً امن وسکون پسند فیضؔ پر ادب کے ارتقا کے صحیح راستے کے سلسلے میں پسِ پردہ بحثوں اور جھگڑوں کا بڑا اثر پڑتا تھا۔ یاد رہے کہ فیضؔ تحریک کے بانیوں میں سے ایک تھے اور اس کے معاملوں سے بے نیاز نہیں رہ سکتے تھے۔ لیکن لگتا ہے کہ کچھ بول بھی نہیں سکتے تھے (یہ طویل عبارت ہے) یا مناسب ہی نہیں سمجھتے تھے کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ ان کے کہنے کا سوویت عہدے داروں پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔' (مہ وسال آشنائی، ص ۲۷۰)

روس میں شکست وریخت کا یہ عمل جاری تھا اور اس کا مکمل انہدام فیضؔ کی وفات کے سات سال بعد ہوا لیکن فیضؔ کو اس سے پہلے ہی ان حالات کا اندازہ ہو گیا تھا جو کسی نظریے کے شکستہ ہونے کے بعد کسی نظریاتی انسان پر وارد ہوتے ہیں۔ فیضؔ کے کلام کا آخری حصہ جو 'نسخہ ہائے وفا' میں شامل ہے، اس کا عنوان فیضؔ نے 'غبارِ ایام' رکھا ہے۔ لگتا ہے کہ اس وقت انہیں ساری نظریاتی دنیا میں گرد وغبار ہی نظر آرہا تھا۔ اسی لیے لُدمیلا نے بھی اس رُخ کی طرف یوں اشارہ کیا ہے کہ فیضؔ کی زندگی کے آخری سات آٹھ برس جس کے دائرے میں 'مرے دل مرے مسافر' اور اس کے بعد سے ۱۹۸۴ء تک کی شاعری ہے، ان کی آخری دور کی شاعری تک متوجہ ہو جائیں۔ یہ درست ہے کہ فیضؔ کی شاعری میں آخر تک تھکن یا شکستگی نہیں آئی کیونکہ وہ تو واضح طور پر کہہ چکے تھے۔

ہم تو مجبورِ وفا ہیں مگر اے جانِ جہاں
اپنے عشاق سے ایسے بھی کوئی کرتا ہے

تیری محفل کو خدا رکھے ابد تک قائم
ہم تو مہماں ہیں گھڑی بھر کے ہمارا کیا ہے

یہ ساری کیفیات 'مرے دل مرے مسافر' میں بھی موجود ہیں اور 'غبارِ ایام' میں بھی اور ساتھ ہی یہ سوال بھی کہ 'اب کیا کرنا ہے؟' اس کشمکش کو فیضؔ نے یوں ظاہر کیا ہے۔

یہ جامۂ روز و شب گزیدہ
مجھے یہ پیراہن دریدہ
عزیز بھی ناپسند بھی ہے
کبھی یہ فرمانِ جوشِ وحشت
کہ نوچ کر اس کو پھینک ڈالو
کبھی یہ اصرارِ حرفِ الفت
کہ چوم کر پھر گلے لگا لو

ہر بحرانی دور میں صورتِ حال کو پیشِ نظر رکھ کر یہ سوچنا پڑتا ہے کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ اقبال نے بھی مثنوی لکھی تھی 'پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق' اور 'اب کیا کیا جائے' جیسے عنوانات کے تحت ٹالسٹائی اور لینن کی تحریریں بھی موجود ہیں۔ فیضؔ نے بھی اپنے رفیقانِ سفر یا روحِ عصر سے یہ سوال کیا۔

تم ہی کہو کیا کرنا ہے

اسی عنوان کی نظم کا ابتدائی حصہ نظریاتی جدوجہد کا آغاز اور اس کا منظرنامہ پیش کرتا ہے۔

جب دکھ کی ندیا میں ہم نے
جیون کی ناؤ ڈالی تھی
تھا کتنا کس بل بانہوں میں
لوہو میں کتنی لالی تھی
یوں لگتا تھا دو ہاتھ لگے
اور ناؤ پورم پار لگی

لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ فیضؔ کہتے ہیں کہ اب ندیا وہی ہے، ناؤ وہی ہے، کسی کو جتنا بھی موردِ الزام

ٹھہراؤ۔ لیکن ۔

چھاتی تو وہی ہے گھاؤ وہی
اب تم ہی کہو کیا کرنا ہے
یہ گھاؤ کیسے بھرنا ہے

گویا زمینی حقائق کو محسوس کرنے کے باوجود فیضؔ کا یہ یقین 'غبارِ ایام' میں بھی قائم رہا کہ جب تک انسانیت کے سینے میں مظلومیت اور ناانصافی کے گھاؤ ہیں اس وقت تک جدوجہد کو ترک نہیں کرنا ہے۔ اس یقین کو فیضؔ نے اس غزل میں بڑی خوبی سے سمویا ہے۔ یہ غزل لاہور فروری ۱۹۸۲ء کی یادگار ہے۔

نہیں نگاہ میں منزل تو جستجو ہی سہی
نہیں وصال میسر تو آرزو ہی سہی
نہ تن میں خون فراہم نہ اشک آنکھوں میں
نمازِ شوق تو واجب ہے، بے وضو ہی سہی
کسی طرح تو جمے بزم میکدے والو
نہیں جو بادہ و ساغر تو ہاؤ ہو ہی سہی
گر انتظار کٹھن ہے تو جب تلک اے دل
کسی کے وعدۂ فردا کی گفتگو ہی سہی
دیارِ غیر میں محرم اگر نہیں کوئی
تو فیضؔ ذکرِ وطن اپنے روبرو ہی سہی

لدمیلا فیضؔ کی زندگی کے آخری برسوں اور قیامِ روس کے علاوہ بھی زیادہ قریب رہیں۔ انہوں نے فیضؔ کو جیتے جاگتے ماحول میں بھی دیکھا اور ان کی شاعری میں بھی۔ ان کے پیشِ نظر وہ حالات تو تھے ہی جن کے ابھرنے سے سوویت یونین کا انہدام ایک منطقی نتیجے کی صورت میں ظاہر ہوا چنانچہ ان کا یہ تجزیہ 'غبارِ ایام' کی شاعری پر پوری طرح صادق آتا ہے۔' ۱۹۸۰ء میں فیضؔ اس بات پر بھی سوچ رہے تھے کہ ان کے نظریات حالیہ نظامِ ہستی سے کہاں تک مطابقت رکھتے ہیں؟ سوویت ملک کا سیاسی وسماجی نظام خود ان کے نظریات اور تصورات سے کہاں تک ہم آہنگ ہے؟

ہوسکتا ہے ان دنوں یہی سوال شاعر کے دماغ کو کھٹکھٹانے لگے تھے۔

'یہ ایک تسلیم شدہ بات ہے کہ ہر بڑا شاعر اپنی قسم کا پیابر ہوتا ہے۔ جس کے اشعار میں باشعور یا بے اختیار طور پر مستقبل کی پیش بینی کی جاتی ہے یا کم از کم اس کی طرف کچھ اشارے کیے جاتے ہیں۔ یہ مفروضہ غلط نہیں معلوم ہوتا ہے کہ فیضؔ کے آخری دور کے کلام کی بنیاد میں ان کی شاعرانہ حِس کارفرما ہے۔ جس نے ان کو دنیا میں آنے والے تغیرات کا احساس دلایا۔ ایسے تغیرات کا جن کا خیال اس زمانے میں کسی سوویت شہری کو خواب میں بھی نہیں آ سکتا تھا اور جو فیضؔ صاحب کے انتقال کے سات سال بعد رونما ہوئے۔ ان کو اس بات کا شدید احساس ہونے لگا کہ ان کے نظریاتی نصب العین کی بنیاد اتنی مضبوط نہیں ہے جتنی پہلے معلوم ہوتی تھی۔ بے شک ان کے لیے یہ ایک بڑا ذاتی المیہ تھا۔' (ص ص ۸۸۔۲۸۷)

میرا خیال ہے کہ ان الفاظ میں لدمیلا نے فیضؔ کی فکر اور بصیرت کو جو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے کہ 'ایسے تغیرات کا خیال کسی سوویت شہری کو خواب میں بھی نہیں آ سکتا تھا' فیضؔ کی عظمت کے لیے بہترین خراجِ عقیدت ہے، اسی لیے جب ہم 'غبارِ ایام' پر نظر ڈالتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ 'مرے دل مرے مسافر' اور 'غبارِ ایام' اگرچہ الگ الگ مجموعے ہیں لیکن ان میں احساس کا دائرہ ایک ہی ہے۔ اسی لیے فیضؔ کی وہ نظم جو انہوں نے جنوری ۱۹۷۹ء میں امریکہ میں لکھی تھی، ایک غیبی اشارے کی حیثیت رکھتی ہے۔

ہم دیکھیں گے
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے
جو لوحِ ازل میں لکھا ہے
جب ظلم و ستم کے کوہِ گراں
روئی کی طرح اُڑ جائیں گے
ہم محکوموں کے پاؤں تلے
جب دھرتی دھڑ دھڑ دھڑکے گی
اور اہلِ حکم کے سر اوپر

جب بجلی کڑ کڑ کڑ کے گی
جب ارضِ خدا کے کعبے سے
سب بت اٹھوائے جائیں گے
ہم اہلِ صفا، مردودِ حرم
مسند پہ بٹھائے جائیں گے
سب تاج اچھالے جائیں گے
سب تخت گرائے جائیں گے

تو اطمینان ہوتا ہے کہ فیضؔ کی شاعری ان کی زندگی، ان کا نظریہ کسی قسم کی مایوسی، شکستگی اور بے یقینی پر ختم نہیں ہوا۔ انہیں اندازہ تھا کہ 'ارضِ خدا کے کعبے سے' کس طرح مظلوموں کے حق میں ایک نیا اعلانِ حیات ہوگا۔ یہی رخ فیضؔ کے کلام کی سب سے بڑی دین ہے۔ انہوں نے جو ترانہ مجاہدینِ فلسطین کے لیے لکھا تھا وہ بھی 'غبارِ ایام' میں شامل ہے اور یہ ترانہ کسی طرح بھی غبار میں گم نہیں ہوا بلکہ اس کے حروف روشن اور تابناک طریقے سے اب بھی یقین کی دعوت دے رہے ہیں۔

ہم جیتیں گے
حقّا ہم اِک دن جیتیں گے
بالآخر اِک دن جیتیں گے

اس میں شک نہیں کہ فیضؔ نے آخر وقت تک ہار نہیں مانی لیکن زمانے کے عرض وطول میں جو غبار اُڑ رہا تھا اسے انہوں نے شیشۂ ساعت سے لمحہ لمحہ گرتی ہوئی ریت کی طرح دیکھا اور محسوس کیا اور یہ یقین اپنی شاعری کا حرفِ لازم بنا دیا کہ وقت آئے گا اور اچھا آئے گا۔

مری جان آج کا غم نہ کر کہ نجانے کاتبِ وقت نے
کسی اپنے پل میں بھی بھول کر کہیں لکھ رکھی ہوں مسرتیں

....

مانا کہ یہ سنسان گھڑی سخت کڑی ہے
لیکن مرے دل یہ تو فقط اک گھڑی ہے
ہمت کرو جینے کو تو اِک عمر پڑی ہے

فیضؔ کا پنجابی کلام۔ ایک مطالعہ

پاکستان میں جو زبانیں اردو کے علاوہ بولی اور سمجھی جاتی ہیں ان کی تعداد خاصی ہے۔ ان میں پنجابی زبان کے بولنے والوں کی اکثریت ہے اور چونکہ ہمارے ملک کی تاسیس کے وقت زبانوں کا مسئلہ سائنسی بنیادوں پر حل نہیں کیا گیا اس لیے لسانی معاملات کبھی سیاسی رنگ اختیار کر جاتے ہیں اور کبھی جذباتی اور اس کے اثرات مجموعی طور پر اچھے نہیں ہوتے۔ ہمارے ہمسائے ملک نے آزادی کے فوراً بعد سہ لسانی فارمولا ملک میں رائج کر دیا۔ جس کے تحت ہندی راشٹر بھاشا (state language) ٹھہری، انگریزی کو عالمی روابط کی زبان کے طور پر اپنایا گیا۔ اس کے علاوہ جتنی زبانیں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بولی جاتی ہیں، انہیں وہاں کی اور خود بھارت کی قومی زبان قرار دیا گیا۔ وہاں کئی ایسے ادارے قائم ہیں جو ایک زبان میں شائع ہونے والی کتاب کا ملک کی دیگر قومی زبانوں میں فوری طور پر ترجمہ کر دیتے ہیں اس طرح لسانی اجنبیت ہونے کے باوجود خیالات اور محسوسات کی اجنبیت فروغ پانے سے رہ جاتی ہے۔

ایشیا اور افریقہ میں نو آبادیاتی نظام کے بتدریج خاتمے کے ساتھ قومی زبانوں کا مسئلہ بھی پیدا ہوا۔ چنانچہ لسانیات کے سائنسی اصولوں کے تحت ایک لائحہ عمل تیار کیا گیا جسے Language Engineering کہا جاتا ہے اس میں ہر زبان کے ابتدائی ادوار، اس کے رسم الخط، تلفظ، قواعد، املا اور سماجی و نفسیاتی لسانیات کے تمام گوشوں کو سامنے رکھ کر ہر زبان کی ترویج اور فروغ کے لیے کام کیا جاتا ہے۔ پنجابی زبان کلاسیکی حوالوں کے ساتھ غیر معمولی مقبولیت رکھتی ہے اور اس کی جڑیں بھی بہت گہری ہیں۔ لیکن سرکاری سطح پر پنجابی زبان کے فروغ اور ملکی معاملات میں اس کے

استعمال پر اب تک کوئی خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ پنجابی زبان کا پریس بھی بہت محدود ہے۔ پنجابی میں اخبارات رسالے اور کتابیں بہت کم شائع ہوتی ہیں پھر علامہ اقبالؔ، فیض احمد فیضؔ، احمد ندیم قاسمیؔ، پروفیسر حمیدؔ احمد خاں، سر عبدالقادرؔ، حفیظ جالندھریؔ جیسے شعرا نے اپنا تمام تر مقبول کلام اردو میں لکھا ہے اور ان کی ادبی حیثیت اسی زبان میں اظہار کے ساتھ وابستہ ہے۔ ایسی صورت میں اکثر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان شعرا نے اور ہر ہر زمانے کے پنجابی شعرا نے اپنی مادری زبان میں شاعری کیوں نہیں کی۔ اس ضمن میں فیضؔ صاحب کا مؤقف بہت واضح ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ہمیں اعلیٰ درجے کی وہ پنجابی نہیں آتی جو بلھے شاہ، وارث شاہ، سلطان باہو اور شاہ حسین کے یہاں نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ اقبالؔ اور فیضؔ کی تعلیم و تربیت جس ماحول میں ہوئی اس میں اردو اور انگریزی کو زیادہ تر ذریعۂ اظہار بنایا گیا۔ تاریخ کے حوالوں پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو مغلوں کا دور یقیناً فارسی زبان کے لیے مختص رہا لیکن رنجیت سنگھ نے بھی جس کی حدودِ سلطنت پشاور تک تھی، پنجابی کے بغیر فارسی کو اپنی درباری زبان بنایا۔ فیضؔ کا مؤقف یہ رہا کہ جو زبان معاشرے میں اچھی طرح بولی اور سمجھی جاتی ہے وہ عوام اور حکمرانوں میں یکساں طور پر رواج پاتی ہے۔ ایک دور یقیناً King's English کا رہا ہے لیکن فیضؔ کا کہنا ہے کہ King's پنجابی قسم کی کوئی چیز کبھی نہیں رہی۔ اردو کی جڑیں شہروں میں ہیں جبکہ پنجابی زبان دیہاتوں میں بولی جاتی ہے اور وہیں پروان چڑھتی ہے۔ اردو پر فارسی اور عربی کے اثرات زیادہ نمایاں ہیں۔ پنجابی زبان کے بھی بعض بڑے شاعروں نے عربی، فارسی کے الفاظ اپنے کلام میں شامل کیے ہیں لیکن ان کی حیثیت غالب لفظیات کی نہیں۔ اور زیادہ تر اصناف شاعری جو پنجابی زبان رائج ہیں مثلاً ماہیہ، ڈھولا، دوہڑا اور کافی وغیرہ اردو میں سرے سے ہیں ہی نہیں۔ پنجابی زبان میں موسموں، کھیتوں، فصلوں اور عام دیہاتی زندگی سے علامتیں اور استعارے اخذ کیے جاتے ہیں اور عوام کی کثیر تعداد انہیں کسی لغت اور شرح کے بغیر سمجھ لیتی ہے۔ بقول انشاءؔ

سنایا رات کو قصہ جو ہیر رانجھا کا
تو اہلِ درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

پنجابی زبان کی اس تاثیر کو دیکھتے ہوئے اکثر نوجوان فیضؔ صاحب سے یہ فرمائش کرتے تھے کہ پنجابی میں بھی شاعری کرنی چاہیے۔ کچھ اس فرمائش اور کچھ فیضؔ صاحب کے عوامی رجحانات کا

اثر ہوگا کہ انہوں نے پنجابی میں بھی نظمیں کہیں لیکن ان کی تعداد اتنی نہیں تھی کہ ایک مجموعہ مرتب ہوسکے۔ لہٰذا فیضؔ کے دو عقیدتمندوں ماجد صدیقی اور احمد سلیم نے فیضؔ کے اردو کلام کے ایک انتخاب کا پنجابی میں ترجمہ کیا اور اس میں فیضؔ صاحب کی پنجابی نظموں کو شامل کر کے ایک مجموعہ 'رات دی رات' کے نام سے ۱۹۷۵ء میں شائع کر دیا۔ فیضؔ صاحب نے اس معاملے میں احمد سلیم اور ماجد صدیقی کی کاوش کو سراہا اور اپنی پنجابی کو 'تک بندی' میں شمار کیا ہے اور اس بات کا میں گواہ ہوں کہ فیضؔ صرف پنجابی ہی نہیں، اپنی پوری اردو شاعری کو بھی 'تک بندی' ہی کہا کرتے تھے اس میں یقیناً ان کا وہ انکسار شامل تھا جو انتہائے فضیلت کرنے والوں میں چھو کر بھی نہیں گذرتا اور یہی انکسار ہمیشہ عظمتِ سخن کی دلیل رہا ہے جو فیضؔ کو حاصل تھی۔

فیضؔ نے 'رات دی رات' کے دیباچے میں غزل اور پنجابی زبان کی اصنافِ سخن کے موضوعات اور عروضی نظام پر مختصراً اظہارِ خیال کیا ہے اور کہا ہے کہ پنجابی ادب کے گہرے سمندر کے بیچ میں کچھ قطرے ہماری طرف سے بھی شامل ہو گئے ہیں جسے غنیمت جاننا چاہیے۔ فیضؔ کی طبع زاد پنجابی نظمیں یقیناً اپنا ایک علیحدہ رنگ و آہنگ رکھتی ہیں۔ کسی کا قول ہے کہ صفِ اوّل کا ہنرمند جس شعبے میں بھی جائے گا صفِ اوّل ہی کا رہے گا۔ چنانچہ فیضؔ کے پنجابی کلام میں بھی سخن کی وہ گرمی، حلاوت، جمالیات اور تاثیر موجود ہے جو ان کے اردو کلام میں پائی جاتی ہے مثلاً ان کی نظم کے یہ مصرعے۔

ربّا سچیا توں تے آکھیا سی
جا اوئے بندیا جگ دا شاہ ہیں توں
ساڈیاں نعمتاں تیریاں دولتاں نیں،
ساڈا نیب تے عالی جاہ ہیں توں،
ایس لارے تے ٹور کد پچھیا ای
کِیہ ایس نمانے تے بیتیاں نیں
کدی سار وی لئی او رب سائیاں
تیرے شاہ نال جگ کیہہ کیتیاں نیں
کِتے دھونس پولیس سرکار دی اے

کتے دھاندلی مال پٹوار دی اے
اینویں ہڈاں وچ کلپے جان میری
جیویں پھائی چ کونج کرلاوندی اے
چنگا شاہ بنایا ای رب سائیاں
پولے کھاندیاں وارنئیں آوندی اے

ابنِ خلدون نے لکھا ہے کہ زبان پیالے کی مانند ہوتی ہے اور خیال اس پیالے میں پیش کیے جانے والے مشروب کی حیثیت رکھتا ہے۔ پیالہ مٹی، چاندی اور سونے کا بھی ہوسکتا ہے لیکن اگر مشروب ایک ہے تو پیالے کی ظاہری ہیئت کی وجہ سے مشروب میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوگی۔ اقبالؔ اور فیضؔ کے ادبی کارناموں پر یہ اصول پوری طرح صادق آتا ہے۔ اقبالؔ نے اردو، فارسی اور انگریزی میں اپنی فکر پیش کی۔ فیضؔ نے بھی اردو، انگریزی اور پنجابی میں اپنے نظریات و جذبات کو اجاگر کیا۔ یقیناً لسانی پیرائے اہمیت رکھتے ہیں لیکن ایک ترقی پسند شاعر اور دانشور کی حیثیت سے فیضؔ کا اوّلین مقصد اس پیغام کو عام لوگوں تک پہنچانا ہے جس سے انسان دوستی کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو اور اس میں فلسفیانہ گہرائی اسی حد تک آسکتی ہے جس کا ایک عام خواب دیکھنے والا ذہن متحمل ہوسکتا ہے۔ ایک نظم میں فیضؔ نے خیر مقدمی انداز پر وہ پیرایہ اختیار کیا ہے کہ نظم ایک نغمے میں ڈھل گئی ہے۔

جھانجراں وانگ، زنجیراں چھنکائیاں نیں،
کدی کنئیں منداراں پائیاں نیں،
کدی پیریں بیڑیاں جائیاں نیں،

جدید پیرایۂ بیان کے ساتھ ساتھ اس روایت کو بھی فیضؔ نے برقرار رکھا ہے کہ جہاں پنجابی کے کلاسیکل شعرا نے 'مٹھڑے یار'، 'جانی یار'، 'بسم اللہ' جیسے پیرایۂ اظہار کو شامل رکھا ہے۔

فجر ہووے تے آکھیے بسم اللہ
اَج دولتاں ساڈے گھر آئیاں نیں
جیہدے قول تے اساں وساہ کیتا
اوہنے اوڑک توڑ نبھائیاں نیں

اسی طرح 'اویار' تخاطب بھی کئی اہم شعرا کے ہاں نظر آتا ہے جیسے بابا بلھے شاہ نے کہا۔

علموبس کریں اویار

فیض بھی اپنی ایک نظم، جسے وہ تارکینِ وطن کے لیے ایک نغمہ قرار دیتے ہیں، نیلی بار کے ایک پرانے گیت سے شروع کرتے ہیں۔

'وطنے دیاں ٹھنڈیاں چھائیں اویار

ٹک رہو تھائیں اویار'

اس نظم میں فیض کے اپنے جلاوطنی کے محسوسات بھی شامل ہیں اور آگے کے مصرعوں میں وارث شاہ کے کرداروں کو بطور علامت استعمال کیا ہے مثلاً ہیر، رانجھیٹے، کھیڑیاں اور اس کے علاوہ یہ مصرعے:

کانگ اوڈاون ماواں، بھیناں

چرخے اوہلے روون مُیاراں

ہاڑاں کردیاں سنجیاں رائیں

فیض کی اس نظم میں زبان، کلچر اور لطیف معنویت پوری طرح نمایاں ہے جسے (subtle nuances) سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ فیض کی ایک نظم کا یہ مصرعہ 'لمبی رات سی درد فراق والی' ان کے اسی ایقان کی بازگشت ہے کہ 'لمبی ہے غم کی شام، مگر شام ہی تو ہے۔'

فیض نے پنجابی میں جتنا کلام بھی کہا ہے اسے تمام فیض شناسوں نے قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اسے فیض کے تخلیقی معیار کو سمجھنے کا ایک اشاریہ بھی بتایا ہے، کیونکہ فیض نے جب بھی شاعری کی ہے اپنے وجود کی داخلی کیفیات سے متاثر ہو کر کی ہے اور اس میں جو مقصدیت ان کے پیشِ نظر رہی ہے اسے شعریت کا روپ دے کر ہی وہ مطمئن ہوتے تھے۔ یہ وصف ان کے پنجابی کلام میں بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔

ضمیمہ جات

فیض *

وی۔جی کیرنن

ترجمہ: پروفیسر سحر انصاری

میں فیض سے کوئی بیس سال قبل اس وقت متعارف ہوا تھا جب وہ ایم۔اے۔او کالج امرتسر میں لیکچرار تھے۔ ایک اور پرانے دوست جو اس وقت فیض کے رفیقِ کار تھے، کل اچانک ایڈنبرا میں دکھائی دیئے اور ان سے مل کر مجھے بیتے ہوئے دن یاد آ گئے۔ معلوم یہ ہوا کہ فیض کو یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ وہ اس قدیم دوست کی ایڈنبرا میں آمد سے مجھے مطلع کریں گے لیکن وہ بھول گئے۔ اس زمانے میں بھی وہ اپنی بھول جانے کی عادت اور غائب دماغی کی وجہ سے خاصے مشہور تھے۔ لیکن ان کے طالب علم ان کی اس عادت کو آسانی سے درگزر کر دیتے تھے کیونکہ اگر کوئی پروفیسر یہ بھول جائے کہ اسے طلبا کو لیکچر دینا تھا تو انہیں کبھی اس کا افسوس نہیں ہوتا۔ اسی طرح تانگہ چلانے والوں کا بھی ان کے ساتھ یہی رویہ تھا کہ وہ کسی کے گھر جا کر باتوں میں مصروف ہو جاتے اور یہ بھول جاتے کہ باہر تانگہ کھڑا ہوا ہے اور اس طرح تانگے والوں کا کرایہ بڑھتا تھا اور ادبی لوگ انہیں یوں معاف کر دیتے تھے کہ وہ اس وقت بھی ایک اہم شاعر تھے۔

مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ اس ہفتے لندن میں ایک ادبی تقریب ان کے اعزاز

---

* یہ مضمون فیض کے شعری مجموعے 'سرِ وادیِ سینا' میں شامل ہے۔

میں منعقد کی جارہی ہے اور مجھے اس کا افسوس ہے کہ میں خود وہاں حاضر ہونے سے قاصر ہوں۔
گذشتہ بار کوئی پانچ سال قبل جب وہ انگلستان آئے تھے تو ایک ایسی ہی تقریب میں شریک ہونے کا مجھے شرف حاصل ہوا تھا۔ اس تقریب کے فوراً بعد فیضؔ یورپ روانہ ہو رہے تھے تاکہ وطن واپس جاسکیں، جہاں انہیں جیل میں ڈال کران کا پُر جوش خیر مقدم کیا گیا۔ کئی ادبی شخصیتوں کی زندگی میں اس قسم کی خفیف غلط فہمیاں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ اس بار وہ نسبتاً زیادہ طویل مدت کے لیے انگلستان میں قیام کررہے ہیں تاکہ خوش قسمتی سے ان کے دوستوں کو مستقبل قریب میں اسی قسم کی کسی اور غلط فہمی کا خوف باقی نہ رہے اور کسی محبِ وطن شاعر کو اپنے وطن سے لگاؤ کیوں نہ ہو یہ امر خاصا دل خوش کن ہوتا ہے کہ بعض اوقات وہ (کسی دوست کی طرح) بہت قریب سے جائزہ لینے کے بجائے چار یا پانچ ہزار میل کے فاصلے سے اپنے وطن کے بارے میں غور و خوض کرے۔
یہ امر بلاشبہ افسوسناک ہے کہ فیضؔ مع اہل و عیال ہمارے یہاں کے متعدد پُرسکون اور رومان انگیز مقامات مثلاً میرے آبائی شہر مانچسٹر یا لیک ڈسٹرکٹ جہاں ایک زمانے میں اتنے سارے شاعروں نے عروج پایا، یا سب سے بڑھ کر ایڈنبرا میں رہنے کے بجائے لندن میں سکونت اختیار کررہے ہیں۔ اسی شہر میں جو اینٹوں، کُہر، شور و غل اور اہالیانِ لندن کا ایک دیو ہیکل مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر جانسن کہا کرتے تھے کہ جب آدمی لندن سے اُکتا جائے تو وہ زندگی سے اُکتا جاتا ہے، لیکن یہ اٹھارویں صدی میں ہوتا تھا۔ آج تو یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ جب آدمی زندگی سے اُکتا جائے تو وہ لندن کا رخ کرتا ہے۔
فیضؔ بلا کے سگریٹ نوش واقع ہوئے ہیں۔ یہ بڑی عادت لندن کے کُہر اور دھند کے ساتھ مل کر کہیں ان کی انتہائی تابناک صلاحیتوں کو ماند نہ کردے، تاہم مجھے کامل یقین ہے کہ اپنی بیوی اور بچیوں کی مدد سے وہ اس مسئلے پر قابو پالیں گے۔ نیز یہ کہ ایک ادبی شخصیت کی حیثیت سے اس ملک میں ان کا قیام تخلیقی ثابت ہوگا۔ وہ اب تک بہت کچھ کرچکے ہیں لیکن انہیں ابھی اور بہت کچھ کرنا ہے اور اب جبکہ وہ دوسرے ہنگاموں سے آزاد ہیں انہیں یقیناً خیال آئے گا کہ ان سے کس قدر زیادہ توقع کی جاتی ہے۔ ان بیس برسوں میں مجھے یقین ہے کہ میں نے انہیں اس قسم کے موضوعات پر کم از کم بیس کتابیں لکھنے کا مشورہ دیا ہے۔ جدید معاشرے میں فنکار کا مرتبہ، تاریخ ادب اردو یا مغربی تہذیب کے مقابلے میں اسلامی تہذیب کی نوعیت وغیرہ وغیرہ۔
ہر شخص کو جوان سے واقف ہے فطری طور پر یہ توقع بھی ہوگی کہ وہ اپنے فرصت کے اوقات میں مزید نظمیں لکھیں گے۔ میری ہمیشہ سے یہ خواہش بھی رہی ہے کہ وہ دوسرے ممالک کی بعض نظمیں

خصوصاً ہمارے عہد کی ترقی پسند شاعری کا ترجمہ اردو میں کریں جو اسی روایت یا عالمی تحریک سے تعلق رکھتی ہو جس سے خود ان کی شاعری وابستہ ہے۔ ویسے جارج بارو، جنہوں نے آئرستان، ڈنمارک اور دوسرے علاقوں کی شاعری کو انگریزی میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنی ایک کتاب لیونگرو (Lavengro) میں لکھتے ہیں کہ: 'ترجمہ زیادہ سے زیادہ ایک بازگشت ہی ہوتا ہے۔'

تمام ترجمہ کرنے والے یقیناً یہی محسوس کرتے ہوں گے لیکن کچھ نہ ہونے سے بازگشت بھی بہر حال بہتر ہے اور فیضؔ کی پیدا کردہ بازگشت کم از کم مترنم ضرور ہوگی۔ گذشتہ دنوں ان سے یہ سن کر میں بے حد متاثر ہوا کہ خود ان کی بعض نظمیں سواحلی زبان میں ترجمہ ہونے کے بعد مشرقی افریقہ میں پڑھی جا رہی ہیں جہاں ایک ملک گیر زبان کی حیثیت سے سواحلی کا مستقبل بہت تابناک نظر آتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ جلد ہی دوسری زبانوں میں بھی ان کے کلام کا ترجمہ ہو جائے گا۔

ایک اسکاٹ خاتون نے جو کئی سال تک افغانستان میں رہی ہیں، فیضؔ کے والد کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے جو اس زمانے میں وہاں وزیرِ اعلیٰ[1] تھے۔ مصنفہ کے بیان کے مطابق وہ بڑے پختہ عزم و ارادہ کے مالک تھے اور انتہائی انتشار کے ماحول میں نظم و نسق قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ امرتسر کی آزادانہ زندگی کے زمانے سے فیضؔ بھی دوسرے متعدد باحوصلہ انسانوں کے دوش بدوش اس جد و جہد میں مصروف ہیں کہ ہمارے جدید عہد کے انتشار میں ضبط و توازن قائم کیا جائے، جو کبھی کبھی افغانستان کے دورِ قدیم سے زیادہ مایوس کن نظر آتا ہے۔ میں ایک اور پشت کو سرگرمِ عمل دیکھنے کا خواہاں ہوں اور چشمِ تصور سے فیضؔ کی بیٹیوں کو اپنی اپنی رغبت کے عظیم کارناموں کی تکمیل میں منہمک دیکھ بھی رہا ہوں۔ ان میں ایک کو غالباً پاکستان کی پہلی عظیم مصورہ کی حیثیت سے اور دوسری کو شاید پہلی خاتون صدر کی حیثیت سے۔

دریں اثنا فیضؔ کے دوستوں کو ہر ہفتے کے خاتمے پر ان سے دریافت کرتے رہنا چاہیے کہ انہوں نے کتنے صفحات لکھ لیے ہیں اور ہر روز شام کو معلوم کرتے رہنا چاہیے کہ انہوں نے کتنے سگریٹ نہیں پیئے ہیں۔

۲۷ نیلس اسٹریٹ۔ ایڈنبرا، ۵ دسمبر ۱۹۶۲ء

۱۔ فیضؔ کے والد سلطان محمد خاں، امیر عبدالرحمٰن خاں والیٔ افغانستان کے دربار میں چیف سیکریٹری کے عہدے پر مامور تھے۔

ضمیمہ۔۲

ایک حوصلہ مند دل کی آواز*

الیکسی سُرکوف

ترجمہ: پروفیسر سحر انصاری

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
لبوں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

ماسکو میں دسمبر کی ایک سرمازدہ شام کو زندگی میں پہلی بار فیضؔ کے ان ولولہ خیز اشعار نے میرے دل میں اضطراب پیدا کیا تھا۔ ۱۹۵۴ء کا سال رخصت ہو رہا تھا اور برف کا ایک طوفان پشکن کے سرمئی مجسمے کے گرد نغمہ ریز تھا۔ پہرہ دار سپاہی چوراہوں پر کھڑے سردی سے کانپ رہے تھے۔ ماسکو کے ایک گرم اور آرام دہ فلیٹ میں مشرقی سوویت کی دوست جمہوری ریاستوں کے شعرا اور بیرونی مشرقی ممالک سے آئے ہوئے مہمانوں کی محفل میں ہندوستان کے شاعر علی سردار جعفری ایک ناآشنا زبان کے اشعار تقریباً گنگنانے کے انداز میں پڑھ رہے تھے۔ اشعار سب کے دلوں کو مسحور کرتے جا رہے تھے۔ ان اشعار میں محبت کے نازک جذبوں کی کسک تھی۔ زنداں کی تنہا کوٹھڑی

* یہ مضمون فیضؔ کے شعری مجموعے 'سرِ وادیٔ سینا' میں شامل ہے۔

میں مقید انسان کا غمِ تمنا تھا اور ایک انقلابی کا شعلہ خیز غیظ وغضب بھی تھا۔ یہ اشعار فیض احمد فیض کے تھے جو ہماری صحبت میں شامل نہ ہو سکے تھے اور ماسکو سے بہت دور منٹگمری جیل میں تنہائی کے شب وروز بسر کر رہے تھے، اسی لمحہ شاید وہ جیل کی سلاخوں سے باہر کا منظر دیکھ رہے ہوں گے۔ وہ رخشندہ ستاروں سے معمور آسمان کو تک رہے ہوں گے یا پھر شاید اپنے حوصلہ مند دلِ پُرسوز کی گہرائی میں جنم لینے والے مصرعے سرگوشی کے انداز میں دہرا رہے ہوں گے۔

تین ماہ بعد ___ وقت وہی تھا جو ماسکو میں گذشتہ موسم سرما کی ہواؤں کی موجودگی میں تھا۔ میں نے ایک بار پھر ایسے اشعار سنے جو دل کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں اور ان کے تاثر کی توانائی ہی سے مفہوم اور تفہیم کی منزلیں طے ہونے لگتی ہیں۔

اس وقت میں دہلی میں تھا۔ مارچ کا آغاز تھا، سیاہ جنوبی آسمان پر بے شمار ستارے جھلملا رہے تھے اور اس پس منظر میں سدابہار درخت رات کی دھند میں ایستادہ نظر آ رہے تھے۔ لال قلعہ کی دور افتادہ اور سنگین دیواروں کے سائے میں گاڑیاں خاموشی سے گذر رہی تھیں اور رکشہ چھلاوؤں کی طرح بھاگ رہے تھے۔ وہ سب اس مقام کی طرف رواں دواں تھے جہاں قمقموں سے روشن وسیع وعریض، رنگارنگ پنڈال، سبزے کے قطعات اور بے شمار رنگین پھولوں سے لدے ہوئے نامانوس درخت اپنی بہار دکھا رہے تھے۔

پنڈال میں ایک مشاعرہ ہو رہا تھا۔ یکے بعد دیگرے شاعر مائیکروفون پر آتے رہے اور مشاعرے میں جان پڑتی رہی اور پھر جعفری نے چند ایسی نئی نظموں کا آغاز کیا جو منٹگمری جیل کے تنہا کمرے کی اداس اور سنگین دیواروں میں مقید رہ کر لکھی گئی تھیں۔

اب فیض وہاں اپنی اسیری کا پانچواں سال گذار رہے تھے۔

رنگ برنگے پنڈال میں اچانک سناٹا اور ارتعاش پذیر سکوت چھا گیا۔ ہر لفظ صاف سنائی دے رہا تھا۔ ایک ایک لفظ دلوں میں اترتا چلا جا رہا تھا اور ایسے مقامات پر جہاں شاعر کے اشعار احساس کی گہرائی میں ڈوب جاتے اور پھر غیظ وغضب کی بازگشت بن کر ابھرتے تو جیسے سارا پنڈال ایک دم بیدار ہو جاتا اور نغمہ گر کی آواز کے ساتھ ساتھ بڑے جوش وخروش سے داد دینے لگتا۔

اس وقت میں فیض احمد فیض کے بارے میں کیا جانتا تھا:

یہی کہ اپنے عوام کو نوآبادیاتی نظام کی غلامی سے آزاد کرانے کی جدوجہد میں وہ جوانی کے

زمانے سے ہی تن دہی کے ساتھ شامل ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں فاشزم سے اپنی نفرت کے اظہار کے لیے وہ بدیسی اینگلو انڈین فوج میں ایک افسر بن گئے تھے اور جنگ کے بعد کرنل کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے وہ ایک پُر جوش صحافی تھے جو نو آبادیاتی شکنجے اور اور مقامی آقاؤں کی غلامی سے اپنے عوام کو آزاد کرانے کے تصورات کو فروغ دینے کے لیے جان ودل سے سرگرمِ عمل ہیں۔

فیض اپنی شاعری، اپنی سیاسی تحریروں اور ایک پُر خلوص انقلابی کی حیثیت سے اپنی سرگرمیوں کے ذریعے پاکستان کے بہترین فرزندانِ وطن کے دوش بدوش بے غرضی اور جوش و خروش کے ساتھ جدوجہد میں مصروف ہیں۔ رجعت پسند اس باکمال شاعر کی قوتِ صداقت اور توانائی الفاظ سے خوفزدہ تھے۔ چنانچہ عذابِ تنہائی اور جبری بے کاری کا شکار بنانے کے لیے انہوں نے منٹگمری اور حیدر آباد کی جیلوں میں فیض پر پانچ سال کی طویل اسیری مسلط کر دی تھی۔ لیکن شاعر کے زندہ اور حیات پرور دل کی دھڑکنوں پر سنگلاخ زنداں کی تاریک رات غالب نہ آسکی اور نہ ایامِ اسیری کی بے حس اور جامد خامشی ان کے نغموں پر کوئی مہرِ سکوت ثبت کر سکی۔

زنداں کی سنگین دیواروں میں سے بھی ان کی حوصلہ مند دل سے وہ نغمے بے تاب ہو کر نکلتے رہے جو عوام، زندگی اور مادرِ وطن کی محبت سے لبریز تھے۔ ان کے نغمات کے پیروں کی سرسراہٹ پاکستان اور متعدد دوسرے ممالک کی سرزمین پر سنائی دیتی رہی اور لاکھوں انسانوں کے دلوں کو گرماتی رہی۔

آخر کار رجعت پسندی کی تیرگی اور انقلابی شاعری کی روشنی کی جنگ میں شاعری ہی کامران و فتح مند رہی۔ خطرے اور وہ بھی موت کے مسلسل خطرے سے عبارت پانچ سال کی قید و بند کی صعوبتیں ختم ہوئیں اور محبِ وطن شاعر آزاد ہو گیا۔ ایک بار پھر ماضی کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ جوش اور ولولے کے ساتھ اس جدوجہد کو جاری رکھنے کے لیے جس کی خاطر اس نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ اپنے ہم وطنوں کے لیے، تمام اقوام کے مابین دوستی کو فروغ دینے کے لیے اور تمام انسانوں کے لیے امن کی فضا پیدا کرنے کے لیے ___ اور اب زنگ خوردہ زنجیروں اور ہتھکڑیوں کی گرفت سے آزاد ہو کر وہ زیادہ توانائی اور جذبے کی سچائی کے ساتھ اپنے شعلہ صفت نغمات فضا میں بکھیر رہا ہے۔

۱۹۵۸ء کے موسمِ خزاں کے بعد تاشقند میں افروایشیائی ادیبوں کا مشہور اجلاس ہوا جس میں فیض نے ایک مقتدر قائد کی حیثیت سے شرکت کی۔ وہاں ان سے پہلی بار میری ملاقات ہوئی۔ اس شاعر سے ملاقات ہوئی جس کا تصور میں اپنے دل میں بسائے ہوئے تھا۔

فیض کے لیے وہ نسبتاً اداسی کا زمانہ تھا۔ پاکستان میں حکومت کا تختہ الٹ کر غیر جمہوری طاقتوں نے اقتدار سنبھال لیا تھا۔

ماسکو میں ادیبوں کی انجمن کے ایک کمرے میں ہم بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم دونوں نظمیں پڑھ رہے تھے اور روسی زبان میں فیض کی نظموں کا ایک مجموعہ شائع کرنے کی بابت بات چیت کر رہے تھے۔ پھر اتفاق سے ہماری گفتگو کا رُخ نظموں سے ہٹ کر اس وقت کی سیاست کی طرف ہوگیا۔

'تو پھر مستقبلِ قریب میں آپ کا کیا ارادہ ہے؟'

فیض نے اپنی سیاہ آنکھوں سے، جن کی گہرائی میں قدرے اداسی تھی، میری طرف دیکھا لیکن ان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ موجود تھی۔

بس، پہلے تو میں لندن جاؤں گا۔ وہاں اپنے بعض دوستوں سے ملوں گا جو ابھی پاکستان سے آئے ہیں۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ میں کراچی، لاہور اپنے وطن واپس چلا جاؤں گا۔'

'لیکن آپ جانتے ہیں کہ اب وہاں......'

ان کے ہونٹوں کے کناروں پر وہی ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

'ظاہر ہے کہ اس صورت میں تو مجھے وطن ہی واپس جانا چاہیے۔'

'تو پھر جیل یقینی ہے؟'

'شاید......اور اگر کسی بڑے مقصد کی خاطر انسان کو جیل بھی جانا پڑے تو ضرور جانا چاہیے۔'

'لیکن اگر جیل سے بھی بدتر کچھ ہو تو......؟'

شاعر نے کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھا جہاں باغ کے وسط میں ٹالسٹائے کا مجسمہ نصب تھا۔ سرد اور خزاں زدہ آسمان پر نظر ڈالی۔ مسکراہٹ بدستور موجود تھی۔ چند لمحے کے توقف کے بعد انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں آہستہ سے کہا:

'اگر جیل سے بھی بدتر کوئی چیز ہوئی تو پھر یقیناً برا ہوگا، لیکن تم جانتے ہو جدوجہد بہر حال جدوجہد ہے۔'

زمانے سے ہی تن دہی کے ساتھ شامل ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں فاشزم سے اپنی نفرت کے اظہار کے لیے وہ بدیسی اینگلوانڈین فوج میں ایک افسر بن گئے تھے اور جنگ کے بعد کرنل کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے وہ ایک پُر جوش صحافی تھے جو نوآبادیاتی شکنجے اور اور مقامی آقاؤں کی غلامی سے اپنے عوام کو آزاد کرانے کے تصورات کو فروغ دینے کے لیے جان ودل سے سرگرمِ عمل ہیں۔

فیض اپنی شاعری، اپنی سیاسی تحریروں اور ایک پُرخلوص انقلابی کی حیثیت سے اپنی سرگرمیوں کے ذریعے پاکستان کے بہترین فرزندانِ وطن کے دوش بدوش بے غرضی اور جوش وخروش کے ساتھ جدوجہد میں مصروف ہیں۔ رجعت پسند اس باکمال شاعر کی قوتِ صداقت اور توانائی الفاظ سے خوفزدہ تھے۔ چنانچہ عذابِ تنہائی اور جبری بے کاری کا شکار بنانے کے لیے انہوں نے منٹگمری اور حیدرآباد کی جیلوں میں فیض پر پانچ سال کی طویل اسیری مسلط کردی تھی۔ لیکن شاعر کے زندہ اور حیات پرور دل کی دھڑکنوں پر سنگلاخ زنداں کی تاریک رات غالب نہ آسکی اور نہ ایامِ اسیری کی بے حس اور جامد خامشی ان کے نغموں پر کوئی مہرِ سکوت ثبت کرسکی۔

زنداں کی سنگین دیواروں میں سے بھی ان کی حوصلہ مند دل سے وہ نغمے بے تاب ہوکر نکلتے رہے جو عوام، زندگی اور مادرِ وطن کی محبت سے لبریز تھے۔ ان کے نغمات کے پیروں کی سرسراہٹ پاکستان اور متعدد دوسرے ممالک کی سرزمین پر سنائی دیتی رہی اور لاکھوں انسانوں کے دلوں کو گرماتی رہی۔

آخرکار رجعت پسندی کی تیرگی اور انقلابی شاعری کی روشنی کی جنگ میں شاعری ہی کامران و فتح مند رہی۔ خطرے اور وہ بھی موت کے مسلسل خطرے سے عبارت پانچ سال کی قید وبند کی صعوبتیں ختم ہوئیں اور محبِ وطن شاعر آزاد ہوگیا۔ ایک بار پھر ماضی کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ جوش اور ولولے کے ساتھ اس جدوجہد کو جاری رکھنے کے لیے جس کی خاطر اس نے اپنی زندگی وقف کردی تھی۔ اپنے ہم وطنوں کے لیے، تمام اقوام کے مابین دوستی کو فروغ دینے کے لیے اور تمام انسانوں کے لیے امن کی فضا پیدا کرنے کے لیے ___ اور اب زنگ خوردہ زنجیروں اور ہتھکڑیوں کی گرفت سے آزاد ہوکر وہ زیادہ توانائی اور جذبے کی سچائی کے ساتھ اپنے شعلہ صفت نغمات فضا میں بکھیر رہا ہے۔

۱۹۵۸ء کے موسمِ خزاں کے بعد تاشقند میں افروایشیائی ادیبوں کا مشہور اجلاس ہوا جس میں فیض نے ایک مقتدر قائد کی حیثیت سے شرکت کی۔ وہاں ان سے پہلی بار میری ملاقات ہوئی۔ اس شاعر سے ملاقات ہوئی جس کا تصور میں اپنے دل میں بسائے ہوئے تھا۔

فیض کے لیے وہ نسبتاً اداسی کا زمانہ تھا۔ پاکستان میں حکومت کا تختہ الٹ کر غیر جمہوری طاقتوں نے اقتدار سنبھال لیا تھا۔

ماسکو میں ادیبوں کی انجمن کے ایک کمرے میں ہم بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم دونوں نظمیں پڑھ رہے تھے اور روسی زبان میں فیض کی نظموں کا ایک مجموعہ شائع کرنے کی بابت بات چیت کر رہے تھے۔ پھر اتفاق سے ہماری گفتگو کا رُخ نظموں سے ہٹ کر اس وقت کی سیاست کی طرف ہو گیا۔

'تو پھر مستقبلِ قریب میں آپ کا کیا ارادہ ہے؟'

فیض نے اپنی سیاہ آنکھوں سے، جن کی گہرائی میں قدرے اداسی تھی، میری طرف دیکھا لیکن ان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ موجود تھی۔

بس، پہلے تو میں لندن جاؤں گا۔ وہاں اپنے بعض دوستوں سے ملوں گا جو ابھی ابھی پاکستان سے آئے ہیں۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ میں کراچی، لاہور اپنے وطن واپس چلا جاؤں گا۔'

'لیکن آپ جانتے ہیں کہ اب وہاں......'

ان کے ہونٹوں کے کناروں پر وہی ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

'ظاہر ہے کہ اس صورت میں تو مجھے وطن ہی واپس جانا چاہیے۔'

'تو پھر جیل یقینی ہے؟'

'شاید......اور اگر کسی بڑے مقصد کی خاطر انسان کو جیل بھی جانا پڑے تو ضرور جانا چاہیے۔'

'لیکن اگر جیل سے بھی بدتر کچھ ہو تو......؟'

شاعر نے کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھا جہاں باغ کے وسط میں ٹالسٹائے کا مجسمہ نصب تھا۔ سرد اور خزاں زدہ آسمان پر نظر ڈالی۔ مسکراہٹ بدستور موجود تھی۔ چند لمحے کے توقف کے بعد انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں آہستہ سے کہا:

'اگر جیل سے بھی بدتر کوئی چیز ہوئی تو پھر یقیناً برا ہوگا، لیکن تم جانتے ہو جدوجہد بہرحال جدوجہد ہے۔'

یہ تھا اُن کا پُر سکون لیکن پُر اعتماد جواب۔

میں اپنی زندگی میں ایسے متعدد افراد سے مل چکا ہوں۔ ان میں سے بہت سے نڈر، بے باک اور جرأت مند بھی تھے اور اپنی زندگی کے نصب العین کی تکمیل میں جان و دل سے منہمک بھی۔ وہ ہر قسم کی اذیت یہاں تک کہ ناگزیر موت برداشت کرنے کا بھی حوصلہ رکھتے تھے۔

فیضؔ میں یہ ضبط و تحمل اور یہ اعتماد، اذیت کوشی اور موت سے نبرد آزمائی کی بدولت پیدا ہوا ہے۔ ایک ایسی موت جو جدوجہد کے لیے خود کو وقف کر دینے والوں کے لیے ناگزیر ہوتی ہے۔

تاہم مصائب و ابتلا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی جو جرأت فیضؔ میں تھی اس نے میرے سارے وجود کو ڈگمگا دیا۔

فیضؔ کی شاعری کا ترجمہ کرنے کی غرض سے میں نے ان کا ایک ایک مصرعہ بڑے غور سے پڑھا۔ میری کوشش یہ تھی کہ جہاں تک ممکن ہو (ترجمہ شدہ) مصرعوں میں ترنم اور ان کے حساس اور حوصلہ مند دل کا جذبہ برقرار رہے۔ اس کوشش میں نہ صرف ان کے اشعار کا جذباتی زیر و بم، جسے دوسری زبان میں منتقل کرنا تقریباً ناممکن ہے، بلکہ ایک جانباز اور شاعر انسان کا پُر سکون اور واضح ضبط و تحمل میری روح میں گونجنے لگا۔ شاعر، جس نے ایک انقلابی کی حیثیت سے خود اپنی زندگی کو ایک نغمے میں ڈھال لیا اور اپنے نغمے کو جدوجہد کا ایک مؤثر ہتھیار بنا لیا ہے۔ جدوجہد کے مراحل سے گزرتے ہوئے مشرق کے ایک ممتاز ترین ترقی پسند شاعر فیض احمد فیضؔ کے ان نغمات کو سوویت قارئین سے روشناس کراتے ہوئے مجھے بے پایاں مسرت ہو رہی ہے۔

مطالعے کے دوران فیضؔ کی شاعری میں ابتلائے اسیری کا تاثر بھی محسوس ہوتا ہے جس سے دل اداس ہو جاتا ہے۔ لیکن پھر شعلہ خیز جوش و جذبہ اس تاثر پر غالب آ جاتا ہے۔ تیرگی کا استعارہ ان کی شاعری میں بار بار آتا ہے لیکن وہ اشعار زیادہ تابناک ہیں جن میں شاعر کے وطن پر طلوع ہونے والی سحر کے نورِ اوّلین کا خیر مقدم کیا گیا ہے اور مطالعہ کرنے والا یقیناً محسوس کرے گا کہ آزادی کی محبت اور شاعر کے مصائب زدہ وطن کو حقیقی شاعری کس طرح ہم آہنگ و ہم رنگ کر دیتی ہے۔

(روسی زبان میں مجموعۂ کلام کا دیباچہ، ۱۹۶۲ء)

ضمیمہ۔۳

کرّارنوری کی غزل

دردمندی اور تمکنت کا امتزاج*

فیض احمد فیضؔ

جوشؔ مرحوم نے اپنے ایک مجموعۂ کلام کا نام 'شعلۂ و شبنم' رکھا تھا، کچھ ایسا ہی اجتماعِ ضدّین کرار نوری صاحب نے اپنے نام کے لیے تجویز کیا۔ کرّوفر اور نور علی نور تو سنتے آئے ہیں لیکن نورِ کرّار یا کرّاری نور تو بالکل انوکھی بات ہے۔ کرّار کے لفظ سے کسی ہتھیار بند جنگجو سپاہی کا تصور ذہن میں آتا ہے اور نور سے سپیدۂ سحر کی خوش رنگی یا داغِ فراقِ صحبتِ شب سے جلی ہوئی شمع کی اُداسی یاد آتی ہے۔ سیّد کرار نوری کی طبعِ رسا کا ایک ثبوت تو یہی دیکھ لیجیے کہ آپ نے ان اضداد کو اپنی ذات اور کلام میں بہت سلیقے سے یکجا کر دکھایا ہے۔ چنانچہ ان کی ذات وصفات کا مرکب بیک وقت کرار بھی ہے اور نوری بھی، پیارے یہ تمہیں سے ہو، ہر کاری دہر مردے۔

کرار نوری صاحب سے اپنی آشنائی تو ایک زمانے سے ہے لیکن کچھ حالات ایسے رہے کہ اُن سے قربِ صحبت کا اتفاق بہت کم نصیب ہوا۔ کراچی میں قیام کے دوران مشاعروں میں اُن سے علیک سلیک ضرور ہوتی رہی لیکن مشاعرے کے نقار خانے میں نہ کسی طوطی کی آواز پر پوری طرح

* کرار نوری کی شاعری کے بارے میں فیضؔ صاحب کا یہ مضمون ادبی جریدے 'سیپ' (کراچی) کے شمارہ نمبر ۴۷، بابت جولائی۔ اگست ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔ یہاں اس مضمون کے صرف ابتدائی دو پیراگراف درج کیے گئے ہیں جن میں مضمون کا پس منظر اور موجودہ کتاب کے مصنف کا ذکر آیا ہے۔

کان دھر سکتے ہیں، نہ کسی کی ذات وصفات کا ٹھیک سے راز کھلتا ہے۔ میں کرار نوری صاحب کا شکرگزار ہوں کہ پہلے آپ نے کارزارِ بیروت میں اپنا مجموعۂ کلام بھجوا کر کچھ کسبِ نور کا سامان پیدا کیا اور اب دو چار ملاقاتوں کے بعد اس تقریب میں شرکت کا اعزاز بخشا مزید برآں رفیقِ محترم پروفیسر مجتبیٰ اور عزیز مکرم سحرؔ انصاری کی تحریریں بھی عطا فرمائیں، جن کے سبب سے ان کی شخصیت کا مرقع اور ان کے کلام کے محاسن دونوں بصیرت افروز ہوئے۔ سچ پوچھیے تو ان اصحاب نے اپنا تو خیر نہیں، نوری صاحب کا یقیناً کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے، انہیں پڑھ کر جی تو یہی چاہا کہ مزید کچھ لکھنے کے بجائے پرانے بزرگوں کی طرح ان ہی کی تحریروں پر ؎ کا نشان بنا دوں، لیکن مجھے معلوم تھا کہ اس پر نوری تو شاید راضی ہو بھی جائیں لیکن کرار کہاں مانیں گے۔ اس لیے ازرہِ امتثالِ امر انہیں بصیر و علیم دوستوں کے بعض نکات کو اپنے الفاظ میں دہرا رہا ہوں۔

....

....

ضمیمہ۔۴

'نمود' پر فیضؔ صاحب کی رائے

آج کل ہم جیسے لوگوں سے کسی نئی تصنیف پر کچھ لکھنے کو کہا جاتا ہے تو ہم عام طور سے بے خیالی میں کچھ 'کیریکٹر سرٹیفکیٹ' قسم کی چیز لکھ دیتے ہیں، یعنی یہ کہ موصوف ذہین ہیں، ہونہار ہیں، چال چلن اچھا ہے، امید ہے اپنے کام میں ترقی کریں گے وغیرہ، اور پھر کبھی کبھار کوئی سحر انصاری صاحب اپنا دیوان بغل میں داب کر آجاتے ہیں کہ اس پر بھی کچھ لکھ دیجیے۔ اور آپ اس کی ورق گردانی شروع کرتے ہیں تو خامہ انگشت بدنداں کا مضمون پیدا ہو جاتا ہے۔ سحر انصاری سے ایک زمانے سے رسم ہے، ان کے کلام سے لطف اندوز ہونے کا بھی کئی بار اتفاق ہوا ہے لیکن بایں ہمہ یہ مجموعہ میرے لیے ایک بالکل نئی دریافت تھی، اسے پڑھ کر سب سے پہلے تو استاد کا شعر ذہن میں آیا ۔

غالبؔ نبود شیوۂ فن قافیہ بندی\
ظلمیست کہ برکلک و ورق میکنم امشب

یہ نہیں کہ سحر کو قافیہ بندی پر پوری قدرت حاصل نہیں ہے، اس پہلو سے دیکھیے تو بھی اس مجموعے میں مشاقی اور ندرت و ایجاد کے کئی عمدہ نمونے ملیں گے لیکن یہ تو ثانوی بات ہے اصل بات تو وہی کلک و ورق پر سوزِ نہاں کی ستم گری ہے اور سحر انصاری کے کلام پر یہ شعر دوسری طرح بھی صادق آتا ہے وہ یوں کہ ان کا موضوعِ سخن ہی بیشتر وہ ہزار گونہ عذاب ہے جو ان دنوں جانِ مجنوں کو ہر لحظہ درپیش رہتا ہے اور وہ ہزار گونہ مظالم جو ان دنوں ہر حساس اور باضمیر ذات پر توڑے جاتے ہیں، ان سب کا مرکزی نقطہ میری سمجھ میں بیگانگی اور چپقلش کا وہ مرکب ہے جسے انگریزی

زبان میں alienation کہتے ہیں، یا وہ کرب اور نا آسودگی جو اس کیفیت سے پیدا ہوتے ہیں، یہ خون خرابہ خود اپنی ذات سے بھی کیا جاتا ہے، عقائد و روایات سے بھی، اپنے معاشرے اور اس کے چلن سے بھی، اس موضوع کا کچھ نہ کچھ سطحی بیان تو قریب قریب آجکل کے سبھی شعرا میں ملتا ہے لیکن جس سنجیدگی اور غور و فکر سے اس کا بیان سحر کے کلام میں ہوا ہے کچھ ڈھونڈے ہی سے ملے گا، اس اعتبار سے 'نموؤ' کے مطالعے سے ن۔م۔ راشد اور مصطفیٰ زیدی کی یاد آتی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ اوّل تو سحر کے کلام میں ابہام یا الہام کی کوئی آمیزش نہیں اور دوسرے زندگی کے روزمرہ مظاہر سے، پل ہو یا سڑک، شفاخانہ ہو یا تجربہ گہ کسی ذہنی یا جذباتی تجربہ کی تجرید اور کشید کے بعد جس طرح سحر انہیں نظم کرتے ہیں وہ انہیں سے مخصوص ہے۔

ایسا تو خیر نہیں ہے کہ سحر انصاری صرف زندگی کے منفی پہلوؤں پر نظر رکھتے ہیں تاہم مجھے یہ شکایت ضرور ہے کہ بت شکنی کے کرب کو شاید بت گری کی لذت پر اتنا غالب نہیں ہونا چاہیے تھا، لیکن یہ تو اپنے اپنے مزاج کی بات ہے۔ 'نموؤ' ایک بہت تعلیم یافتہ، خیال افروز اور سنجیدہ ذہن کی تخلیق ہے جسے جدید ادب میں ایک معتبر اضافہ سمجھنا چاہیے۔

'نمود' پر فیض صاحب کی تحریر کا عکس

17.8.1976

1

TELEPHONE NO.: 83046

CONSULTANT
CULTURAL AFFAIRS
MINISTRY OF EDUCATION

27/G, GULBERG II
LAHORE

Ref. No. .... *Date* ....

آج کل ہم جب نوجوانوں کی کسی نئی تصنیف پر
کچھ لکھنے کو کہا جاتا ہے تو ہم عام طور سے بے خیالی
میں کچھ "سیریلڈ سرٹیفکیٹ" قسم کی چیز لکھ
دے دیتے ہیں یعنی یہ کہ موصوف ذہین ہیں، ہونہار
ہیں، حال حلقِ احباب، امید ہے آگے چل (کر)
میں ترقی کریں گے وغیرہ، لیکن کبھی کبھار
کوئی شعری الفاظ کی کتاب اپنا دیوان تخیل میں
دل کو گرما جاتی ہیں کہ اس پر بھی کچھ لکھیے

TELEPHONE NO: ...

CONSULTANT
CULTURAL AFFAIRS
MINISTRY OF EDUCATION

27/G. GULBERG II
LAHORE

۲/

Ref. No. ________ Date ________

اور آپ سے اس کی ورق گردانی شروع کرتا

ہوں تو خامہ انگشت بدنداں کا مضمون

پیدا ہو جاتا ہے، سحر انصاری سے ایک زمانے

رسم و راہ ہے، ان کے کلام سے لطف اندوز

ہونے کا موقع بارہا اتفاق ہوا ہے لیکن باایں ہمہ

یہ حقیقت ہے کہ میرے لئے ایک بالکل نئی دریافت

تھی، اسے پڑھ کر سب سے پہلے جو ایک

شعر ذہن میں آیا

غالب نبود شیوۂ من قافیہ بندی

ظلمیست کہ بر کلک و ورق می‌کنم امشب

TELEPHONE NO.: 82040

CONSULTANT
CULTURAL AFFAIRS
MINISTRY OF EDUCATION

27/G, GULBERG II
LAHORE

Ref. No.__________ Date__________

یہ نہیں کہ سحر کو قافیہ بندی پر پوری قدرت
حاصل نہیں ہے، اس کو دیکھیے تو بھی
ایک مجموعے میں خاقانی کے بعد ندرت و ایجاد کے
کئی عمدہ نمونے ملیں گے لیکن یہ تو ثانوی بات
ہے اصل بات تو وہی ~~[illegible]~~ گداز عشق
اور سوز نہاں کی ستم گری ہے جسے سحر انصاری
کا کلام ہے، یہ شعر صبح کی طرح بھی صادق و تابناک
وہ یوں کہ ان کا موضوع سخن ہی بہشت ہو
ہزار گونہ عذاب ہے جو ان دنوں جان جنوں

TELEPHONE NO : 83048

CONSULTANT
CULTURAL AFFAIRS
MINISTRY OF EDUCATION

27/G, GULBERG II
LAHORE

Ref. No. ________ *Date* ________

گو ہر لحظہ در پیش رہتا ہے اور جو ہزار گونہ
مسائل جو اندرونی پر حساس اور باضمیر ذات
پر ٹوٹ پڑتے ہیں، ان سب کا مرکزی
نقطہ میری سمجھ میں بیگانگی یا لاتعلقی کا وہ
مرکب ہے جسے انگریزی زبان میں alienation
کہتے ہیں، یا ہجر اور تنہائی کی جو اس
کیفیت سے پیدا ہوتی ہیں، یہ ذہن خواہ خود
اپنی ذات سے بھی کٹ جاتا ہے، بعض دوسروں
سے بھی، اپنے معاشرے کے اداروں سے چلنے سے بھی،
اس موضوع کا کچھ نہ کچھ سطحی بیان تو قریب

CONSULTANT
CULTURAL AFFAIRS
MINISTRY OF EDUCATION

27/G, GULBERG II
LAHORE

Ref. No. ________ *Date* ....

قریب آ کر کھلتا ہے سبھی شعراء میں ملتا ہے
لیکن حسن مجید کے ہاں یہ غور و فکر سے اس کا
بیان شعر کے طلوع میں شعراء مجھے
ڈھونڈے سے ہی کہیں ملے گا۔ اس اعتبار سے
نمود سحر کے مطالعے سے اقبال، راشد اور
فیض کی شاعری کی یاد آتی ہے لیکن فرق یہ ہے
اول تو یہ کہ شعر کے طلوع میں الہام اور ابہام کی بو تو
آمیزش نہیں لیکن دوسرے زندگی کے روزمرہ
مظاہر سے پیدا ہونے والی کیفیات، شعلہ فشانی یا تجربہ نہ
مگر کسی ذہنی یا جذباتی تجربے کی تجرید کے بعد

TELEPHONE ......

CONSULTANT
CULTURAL AFFAIRS
MINISTRY OF EDUCATION

27/G, GULBERG II
LAHORE

Ref. No. .... *Date* ....

اور گزشتہ کے بعد جس طرح سحر انصاری نظم کر رہے ہیں
وہ انہیں کے مخصوص ہے۔

اس تو ضرور نہیں ہے کہ سحر انصاری ہر طرف زندگی
کے منفی پہلوؤں پر نظر رکھتے ہیں تاہم مجموعہ
شکایت اور دکھ ہے یہ بہت شگفتہ ہے مگر ہے
کو شاید بہت حد تک گہری لذت پر انتہا غالب
نہیں ہو پاتا ہے تھا، لیکن یہ تو اپنے اپنے مزاج
کی بات ہے۔ نمود ایک بہت تعلیم یافتہ،
خیال افروز اور سنجیدہ ذہن کی تخلیق ہے جسے
جدید ادب میں ایک خوشگوار اضافہ سمجھا جانا چاہئے۔

فیض احمد فیض

ضمیمہ۔۵

مولانا چراغ حسن حسرت کا خط اسیر فیضؔ کے نام*

کراچی

۲؍اگست ۱۹۵۲ء

مکرمی

میں نے آپ کو خط لکھا تو امید نہیں تھی کہ اس قدر جلد جواب مل جائے گا، کیوں کہ مجھ سے بعض لوگوں نے کہہ رکھا تھا کہ قریب ترین عزیزوں کے سوا اور کسی سے خط وکتابت کی اجازت نہیں اور کرمانی نے تو مجھ سے بکرّات ومرّات کہا کہ اس نے کئی خط لکھے، کوئی جواب نہ ملا۔ اب معلوم ہوا کہ معاملہ کی نوعیت مختلف ہے۔ میں نے ملاقات کے لیے درخواست دے دی ہے۔ معلوم نہیں یہ درخواست کتنے مرحلے طے کرے۔ بہر حال آپ کو کسی کتاب کی ضرورت ہو تو لکھ دیجیے۔ ساتھ لیتا آؤں گا۔ میری دو بے حیثیت سی کتابیں پچھلے دنوں چھپی ہیں۔ ان میں آپ کو لطف تو کیا آئے گا؟ پھر بھی ساتھ لے آؤں گا۔

اس گوشہ گزینی کے زمانے میں فارسی زبان کے بعض شعرا کے کلام کے مطالعہ کا موقع ملا۔

---

* مولانا چراغ حسن حسرت کا یہ خط جو انہوں نے فیض احمد فیضؔ کو اس وقت لکھا تھا جب وہ راولپنڈی سازش کیس کے سلسلے میں حیدرآباد میں اسیر تھے۔ یہ خط پہلے پہل ہفت روزہ 'لیل ونہار' لاہور کے شمارہ بابت ۲۳ جون ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا۔ 'لیل ونہار' نے اس پر 'رفیدو لے نہ از دلِ ما' کی سرخی لگائی اور ساتھ ہی ایک نوٹ بھی لکھا جس میں اس غیر مطبوعہ خط کے لیے حسرت مرحوم کے صاحبزادے ظہیر الحسن کا شکریہ ادا کیا۔ حسرت کا ان ہی دنوں انتقال ہوا تھا۔ یہاں یہ تاریخی خط مکمل صورت میں نقل کیا جارہا ہے۔

سعدیؔ کے کلیات کا ایک نسخہ ایران کا چھپا ہوا ہاتھ آیا ہے، لیکن اس میں مطائباتؔ نہیں۔ غالباً اسے فحش سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا۔ نول کشور کا چھاپا ہوا کلیات نہیں ملتا جس میں سعدیؔ کا پورا کلام موجود ہے اور بھی کچھ کتابیں ملی ہیں۔ لیکن غلط سلط چھپی ہوئی۔ عرفیؔ کے دیوان میں بہت سے شعر الحاقی ہیں۔ ظہیر فاریابی کا کلام بے مزہ ہے۔ نظیری کا کوئی اچھا نسخہ نہ مل سکا۔ مبارک علی نے دیوان نظیریؔ چھاپا تو ہے، لیکن وہ سر بسر مجموعۂ اغلاط ہے۔

ان دنوں بعض ایسے شعرا کا کلام بھی نظر سے گزرا۔ جنہوں نے زیادہ شہرت نہیں پائی ان میں میر رضیؔ دانش بھی ہے۔ جس کا دیوان نایاب ہے اہلِ تذکرہ نے دو دو چار چار شعر نقل کر دیئے ہیں۔ غلام علی آزاد بلگرامی کا انتخاب مجھے پسند نہیں۔ انہوں نے اساتذہ کے وہی شعر نقل کیے ہیں جو ان کے زمانے کے عام مذاقِ شعر سے مطابقت رکھتے تھے یعنی زیادہ تر مثالیہ اشعار ہیں۔ جو غنیؔ، صائبؔ، قدسیؔ اور علی قلی سلیم کے کلام کے اہم ترین حصہ سمجھے جاتے ہیں۔ البتہ مرزا مظہر جان جاناںؔ نے خریطۃ الجواہر کے نام سے جو بیاض مرتب کی ہے اس سے مرزا کے حسنِ ذوق کا ثبوت ملتا ہے۔ رضیؔ دانش کے چند شعر لکھتا ہوں۔ یہ وہی شاعر ہے جسے دارا شکوہ نے ایک شعر پر ایک لاکھ روپیہ انعام دیا تھا۔ یہ شعر آپ کو یاد ہوگا۔

تاک را سرسبز دار اے ابرِ نیسان بہار
قطرۂ تا مے تواند شد چرا گوہر شود

علامہ اقبالؔ مرض الموت کے زمانے میں رضیؔ دانش کا یہ شعر اکثر پڑھتے تھے۔

تہنیت گوئید مستاں را کہ سنگِ محتسب
بر سرِ من آمد و ایں آفت از مینا گزشت

لیکن علامہ نے دوسرے مصرعے میں تصرف کر کے 'سر' کو 'دل' بنا لیا تھا غالباً اپنے مرض کی رعایت مقصود تھی کیونکہ انہیں قلب کا عارضہ تھا۔ ایک دو شعر اور سنیئے۔

نمک شناس اسیراں کہ از قفس رستند
بہ نخل خانۂ صیاد آشیاں بستند

....

باغ را از رخنہ دیوار می بینم مباد
باغباں چوں در کشاید موسمِ گل بگزد

سینۂ ما جانگدازاں کربلائے حسرت است
آرزوئے کشتۂ ہر سو شہید افتادہ است

....

سوخت پیش از صبح تا خالی نہ بیند جائے شمع
موت را پروانہ برخود سخت آساں کردہ است

رضی دانش مشہد کا رہنے والا تھا۔ شاہ جہاں کے عہد میں ہندوستان آیا کچھ عرصہ دِلّی اور لاہور میں رہنے کے بعد دکن چلا گیا۔ زندگی کے آخری زمانے میں وطن کا قصد کیا اور مشہد ہی میں وفات پائی۔ نسبتی تھا نیسری خالص ہندوستانی شاعر اور رضی دانش سے بہت زیادہ غیر معروف ہے۔ اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

زبس کہ حسن فزود و غمش گداخت مرا
نہ من شناختم اُو را نہ اُوشناخت مرا

....

سخت می ترسم کہ من بسیار می خواہم تُرا
آرزو خوب است لیکن ایں قدر ہا خوب نیست

....

زُلف است و چشم و ابرو و رخسار نسبتی
ایں چند فتنہ اند کہ دریک زمانہ اند

....

مجدِ مرگم ایں قدر دانم کہ خواہی گفت حیف
تا کنم با او وفا عمرش وفاداری نہ کرد

شیخ جمالی کنبوہ بھی انہیں لوگوں میں سے ہیں جنہیں اب کوئی نہیں جانتا۔ یہ شعر انہیں کا ہے۔

مار از خاک کویت پیراہن است برتن
آں ہم نہ آب دیدہ صد چاک تا بہ دامن

دارا شکوہ اور اورنگ زیب دونوں شعر کہتے تھے۔ اورنگ زیب کے تو صرف دو تین شعر مشہور ہیں۔ مثلاً یہ شعر اسی کا ہے۔

غمِ عالم فراواں است و من یک غنچہ دل دارم
چناں در شیشۂ ساعت کنم ریگِ بیاباں را

لیکن داراشکوہ کا پورا دیوان موجود ہے۔ ایک غزل کا مطلع ہے۔

ہر خم و پیچے کہ شُد از تابِ زلفِ یار شُد
دام شُد۔ زنجیر شُد۔ تسبیح شُد، زنّار شُد

جہانگیر نے بہت کچھ کہا ہوگا، لیکن تذکروں میں چند شعر ملتے ہیں۔ یہ مطلع تو قیامت کا ہے۔

ساغرِ مے بر رُخِ گلزار می باید کشید
ابر بسیار است مے بسیار می باید کشید

بابر بڑا صاحبِ ذوق شخص تھا۔ ترکی اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا اور شعر سمجھتا بھی خوب تھا۔ اس کے مصاحبوں میں آتش قندھاری ایک شاعر تھا۔ اس کا یہ مطلع بابر نے خود نقل کیا ہے۔ بچپن میں کہیں پڑھا تھا۔ اب تک یاد ہے۔

سرشکم رفتہ رفتہ بے تو دریا شُد تماشا کن
بیا در کشتیٔ چشمم نشیں و سیرِ دریا کن

سلیمہ سلطان مخفی اکبر کی بیگم اور نہایت خوش ذوق خاتون تھی۔ اس کے کلام کا بڑا حصہ زیب النساء سے منسوب ہو گیا ہے۔ اس کی ایک غزل کا مطلع ہے۔

کاکلت را گرز مستی رشتۂ جاں گفتہ ام
مست بودم زیں سبب حرفِ پریشاں گفتہ ام

اس سلسلے میں یاد آ گیا کہ گنّا بیگم دخترِ قزلباش خان امید بہت اچھے شعر کہتی تھی۔ شجاع الدولہ کی ایک لڑکی مینا بیگم سے بھی بہت سے شعر منسوب ہیں۔ مثلاً یہ مشہور شعر اسی کا ہے۔

ڈبڈبائی آنکھ آنسو تھم رہے
کاسۂ نرگس میں جوں شبنم رہے

کچھ اور شعر سنیئے۔

لکھا زمیں پہ نام مرا اور مٹا دیا
اُن کا تھا کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا

....

جس طرح لگی دل کو مرے چاہ کسو کی
ایسی نہ لگانا مرے اللہ کسو کی

....

شمع کی طرح کون رو جانے
جس کے دل کو لگی ہو سو جانے

دراصل میں تو چاہتا تھا کہ فارسی کے بعض غیر معروف شعرا کی پوری پوری غزلیں نقل کر دوں، لیکن بہک کے کہیں سے کہیں جا پہنچا اور اب یہ خط اتنا لمبا ہو گیا ہے کہ کچھ اور کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ پھر موقع ملا تو کچھ عرض کروں گا۔

عیدالاضحیٰ آ رہی ہے۔ یہاں جن لوگوں سے آشنائی ہے۔ ان سے ہفتوں ملاقات نہیں ہوتی۔ امیر مینائی بھی کبھی کبھی بڑے مزے کا شعر کہہ جاتے ہیں۔ ان کا ایک شعر کہ حسبِ حال ہے، یاد آ گیا۔

رہ گیا اپنے گلے میں ڈال کر باہیں غریب
عید کے دن جس کو غربت میں وطن یاد آ گیا

بہر حال عید کے دن لاہور کی طرف رُخ کر کے نعرہ لگاؤں گا کہ

بآں گروہ کو از ساغرِ وفا مستند
زما سلام رسانید ہر کجا ہستند

یا یہ کہہ کے چپکا ہو رہوں گا کہ

اے ہم نفسانِ محفلِ ما
رفتید ولے نہ از دلِ ما

نیاز مند
حسرت

ضمیمہ۔۶

جیل سے فیضؔ احمد فیضؔ کا خط مولانا چراغ حسن حسرتؔ کے نام*

حسرت صاحب قبلہ۔آداب

آپ کا گرامی نامہ کافی دنوں سے آیا رکھا ہے، ایک زمانے کے بعد کشائش دیدۂ دل کا کچھ سامان ہاتھ آیا اس لیے جواب کی کاوش کی بجائے حظ اندوزی میں محو رہا خاص طور سے رضی دانش کے یہ دو شعر بہت پسند آئے۔

زبس کہ حسن فزودو غمش گداخت مرا
نہ من شناختم اورا نہ اُو شناخت مرا

اور

'آرزو ہا خوب لیکن اینقدر ہا خوب نیست'

پہلے شعر کا ایک جزو داغؔ نے بھی باندھا ہے لیکن اس شعر کے مقابلے میں بہت پھیکا ہے غالباً آپ کو بھی یاد ہوگا۔

وہ روز روز ترقی پہ حسن ہے اُن کا
کہ صورت اُن کی مجھے بھول بھول جاتی ہے

---

* فیض احمد فیضؔ کا یہ خط 'نقوش' کے تاریخی 'مکاتیب نمبر' میں شائع ہوا۔ دیکھیے 'مکاتیب نمبر' (نومبر ۱۹۵۷ء) کی دوسری جلد،ص ص ۱۰۰۹ اور ۱۰۱۰

گنا بیگم کے متعلق ایک عرصے سے تجسس تھا۔ اس کے بارے میں مزید معلومات کا کہیں ذخیرہ ہو تو لکھیے گا، اس کا ایک شعر مجھے بھی یاد ہے۔

کہاں تک لکھے جاؤں خط اُن کو ہمدم
وہ جب بھولتے ہیں یونہی بھولتے ہیں

آپ نے جو غزلیات طوالت کے ڈر سے نہیں لکھیں وہ اب لکھ بھیجئے اور اپنی نئی کتابیں بھی بھیج دیجیے (یہاں سے ایک سطر سنسر آفیسر نے کاٹ دی ہے)۔

ایک زمانے سے آرزو تھی کہ اردو شعرا کا کوئی ڈھب کا انتخاب مرتب ہو جائے۔ آج کل اسی کام میں مصروف ہوں۔ تھوڑا سا کیا ہے، بہت سا باقی ہے۔ حال ہی میں میرؔ و سوداؔ کو دوبارہ استعجاب سے پڑھا جس سے شبہ ہونے لگا ہے کہ سوداؔ میر سے بڑا شاعر تھا۔ یہ صحیح ہے کہ میرؔ کے اچھے اشعار کی نظیر سوداؔ کے ہاں نہیں ملتی لیکن سوداؔ کے کلام کی عام سطح میرؔ سے بلند ہے اور فنی دسترس میں میرؔ ان سے یقیناً پیچھے ہیں۔

میں نے لغویات کا ایک نیا مجموعہ 'دستِ صبا' کے نام سے چھپنے کے لیے بھیج دیا ہے۔ افسوس کہ آپ لاہور میں نہیں ہیں ورنہ میں چاہتا تھا کہ آپ ایک نظر دیکھ لیتے۔ چار پانچ سال انگریزی اخبار میں سر مارنے سے جو تھوڑی بہت اردو آتی تھی وہ بھی بھول گئی ہے۔ اس لیے ان منظومات میں ضرور بہت سی قباحتیں رہ گئی ہوں گی۔ آپ دیکھ لیتے تو کچھ صاف ہو جاتا۔

عید کے دن آپ نے لاہور کی طرف رُخ کر کے نعرہ لگانے کو کہا ہے 'یہاں تو عید شبِ برات کی قید نہیں' مستقل یہی کیفیت رہتی ہے۔ اس کے اظہار میں ایک شعر میں نے بھی کہا تھا۔

یہ ضد ہے یادِ حریفانِ بادہ پیما کی
کہ شب کو چاند نہ نکلے نہ دن کو اَبر آئے

اس وقت بے ساختہ مولانا عبدالباری آسی کی شرح غالبؔ یاد آ گئی جو غالبؔ کے ہر شعر کی تشریح کے بعد لکھتے ہیں۔ 'میں نے بھی کہا ہے۔'

امید ہے آپ کا مزاجِ گرامی بخیر ہو گا۔

نیاز مند
فیض احمد فیضؔ

کچھ مصنف کے بارے میں

پروفیسر سحر انصاری صاحب ملک کے علمی و ادبی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ گزشتہ چار پانچ عشروں میں انہوں نے جس سنجیدگی اور یکسوئی کے ساتھ ادبی موضوعات پر تحریری اور زبانی طور پر اظہارِ خیال کیا اور ادبیات کی تدریس کا اہم فرض سرانجام دیا، اُس کی بجا طور پر ملک بھر میں پذیرائی ہوئی اور اس کی وجہ سے ان کے ارادتمندوں کا ایک وسیع حلقہ بھی قائم ہوا۔

پروفیسر سحر انصاری جامعہ کراچی کے شعبۂ اردو سے وابستہ رہے جہاں انہوں نے کئی سال صدرِ شعبہ کی ذمہ داریاں بھی سرانجام دیں۔ اس سے قبل وہ بلوچستان یونیورسٹی سے وابستہ رہے۔ انہوں نے کئی دوسرے علمی و تحقیقی اداروں اور تنظیموں میں فعال کردار ادا کیا۔ وہ اردو ڈکشنری بورڈ کے مدیرِ اعلیٰ رہے۔ اس کے علاوہ وہ ادارۂ یادگارِ غالب کے نائب معتمد رہے۔ ادھر پچھلے کئی سال سے وہ پاکستان آرٹس کونسل، کراچی کی ادبی کمیٹی کی سربراہی کے حوالے سے شہر کی علمی و تہذیبی سرگرمیوں میں روحِ رواں کی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔

پروفیسر سحر انصاری صاحب کا ایک خاص وصف نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور تخلیقی زندگی کے اس مرحلے میں اُن کی مدد کرنا ہے جب یہ مدد سب سے زیادہ ضروری اور اگلی مسافتوں کے لیے رہنما ثابت ہو سکتی ہے۔ کتنے ہی اچھے تخلیق کار اُن کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی کے سبب اب بڑے اعتماد کے ساتھ گلشنِ ادب کی آبیاری کر رہے ہیں۔

سحر انصاری صاحب ایک قابلِ ذکر شاعر ہیں جنہوں نے 'نمود' اور 'خدا سے بات کرتے ہیں' جیسے اہم اور باقی رہنے والے مجموعے قارئینِ ادب کی خدمت میں پیش کیے ہیں۔ وہ جوش ملیح آبادی کی نثری تحریروں کو 'مقالاتِ جوش' کے عنوان سے مرتب کر چکے ہیں۔ سحر صاحب کے سینکڑوں مقالات و مضامین ادبی رسائل اور جرائد میں شائع ہو چکے ہیں اور کتابی شکل میں مرتب ہونے کے منتظر ہیں۔

پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی

پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی ایک تدریسی و تحقیقی ادارہ ہے جو قومی پارلیمان کے ۱۹۷۶ء کے ایک ایکٹ کے تحت قائم کیا گیا ہے۔ اس ادارے کی تشکیل کا مقصد یہ ہے کہ ایم۔ اے کی سطح پر 'مطالعہ پاکستان' کی تدریس بحیثیت ایک باقاعدہ مضمون کی جائے۔ اس کے علاوہ ایم۔ فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے پروگراموں، نیز دیگر علمی منصوبوں کے ذریعے پاکستانی معاشرے، اس کی تاریخ، تہذیب، مذہب، ادب، سماجی نظام، معیشت و سیاست اور جغرافیہ وغیرہ کے بارے میں تحقیقی کام کیے جائیں جن سے ایک جانب قومی زندگی کے دلکش تنوعات نمایاں ہو کر سامنے آسکیں اور دوسری طرف اس کی مشترک اقدار اجاگر ہو سکیں تاکہ ایک ایسے ہم آہنگ قومی وجود کے نقوش اُبھر سکیں جو قیام پاکستان کا منطقی مطالبہ ہے اور جس کا حصول استحکام پاکستان کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔

پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی اپنے قیام سے اب تک انہی اہداف کے حصول میں منہمک ہے۔ چنانچہ گزشتہ برسوں میں معمول کی تدریسی سرگرمیوں (جو بجائے خود اس لحاظ سے مثبت، نتیجہ خیز اور قابلِ فخر ثابت ہوئی ہیں کہ سینٹر سے فارغ التحصیل سابق طلبہ و طالبات اس وقت ملک کے طول و عرض میں کالجوں اور دیگر تعلیمی اداروں کی سطح پر تدریس میں مصروف ہیں) کے ساتھ ساتھ سینٹر نے قومی زندگی کے اہم موضوعات پر قابلِ قدر تحقیقی کام بھی کیا ہے۔ سینٹر کی انگریزی اور اردو مطبوعات میں مستقل نوعیت کی تصانیف کے علاوہ *Pakistan Perspectives* کے نام سے ایک جرنل اور علمی و تحقیقاتی مضامین پر مشتمل اردو کتابی سلسلہ 'پاکستانیات' شامل ہیں۔ سینٹر کی ان مطبوعات کو علمی حلقوں کی جانب سے جو پذیرائی حاصل ہوئی ہے وہ سینٹر کے لیے سرمایہ افتخار کی حیثیت رکھتی ہے۔

ہماری اردو مطبوعات

پاکستانی معاشرہ اور ادب	مرتبین: ڈاکٹر سید حسین محمد جعفری، احمد سلیم	۱۰۰ روپے
اقبال: فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید (دوسرا ایڈیشن)	مرتب: ڈاکٹر سید حسین محمد جعفری	۲۰۰ روپے
پاکستان میں اردو افسانے کے پچاس سال	شہزاد منظر	۲۵۰ روپے
پاکستانیات جلد نمبر ۱	مرتبین: ڈاکٹر سید حسین محمد جعفری، محمد علی صدیقی	۱۰۰ روپے
پاکستانیات جلد نمبر ۲	مرتب: ڈاکٹر سید جعفر احمد	۲۰۰ روپے
کراچی کے ادبی رسائل	عظمیٰ فرخ	۱۵۰ روپے
جمیل الدین عالی کی تحریروں میں پاکستانیت	مہر النساء عزیز	۱۵۰ روپے
فیض احمد فیض کی صحافت	سیدہ بر جیس بانو	۱۵۰ روپے
پروفیسر آفاق صدیقی اور سندھی ادب	مرتبین: حبیب الرحمٰن، مہر النساء عزیز	۱۵۰ روپے
حسرت کی سیاست	تحقیق و تالیف: احمد سلیم	۳۰۰ روپے
تلاشِ اقبال	ڈاکٹر محمد علی صدیقی	۲۰۰ روپے
صحافت پابندِ سلاسل	ضمیر نیازی	۲۰۰ روپے
مرحلہ شوق	ضمیر نیازی، مرتب: آصف فرخی	۲۰۰ روپے
جنوں میں جتنی بھی گزری۔۔۔ (معروف صحافی اور شاعر حسن عابدی کی یادداشتیں)	ترتیب و تدوین: ڈاکٹر سید جعفر احمد	۲۵۰ روپے
فیض احمد فیض اور پاکستانی ثقافت: تحریریں اور تقریریں	مرتب: شیما مجید	۲۰۰ روپے
نقیبِ انقلاب: مولانا برکت اللہ بھوپالی	شفقت رضوی	۲۵۰ روپے
برصغیر میں تاریخ نویسی کے رجحانات	مرتب: ڈاکٹر مبارک علی	۲۰۰ روپے
جہاتِ حسرت	مرتب: ڈاکٹر سید جعفر احمد	۳۰۰ روپے
تہذیب و تخلیق	ڈاکٹر محمد رضا کاظمی	۲۵۰ روپے
مہر اور اُن کا عہد: مولانا غلام رسول مہر کی سیاسی و صحافتی خدمات	محمد حمزہ فاروقی	۴۰۰ روپے
رسمیاتِ مقالہ نگاری	ڈاکٹر معین الدین عقیل	۵۰ روپے
ڈاکٹر فیروز احمد کے مضامین	مرتب: ڈاکٹر سید جعفر احمد	۸۰۰ روپے
اُمیدِ سحر کی بات سنو (جنگ زدہ دنیا میں امن کے خواب)	زاہدہ حنا	۴۰۰ روپے
سیلاب ڈائری	وسعت اللہ خان	۴۰۰ روپے
فیض شناسی (فیض احمد فیض کی ہمہ جہت شخصیت کے اوجھل پہلو)	عبد الرؤف ملک	۴۰۰ روپے